روزنامچہ

یا

مجنوں کی ڈائری

قاضی عبدالغفار

ناشر:-
آزاد بکڈپو ہال بازار امرتسر

قیمت دو روپیہ پچیس پیسہ

۲/۲۵ روپیہ پیسے

(لکھنؤ لیتھو پریس دہلی)

ماضی

متاعِ رفتہ ہے
اِس کا غم کیا؟

حال

رفتنی اور گذشتنی ہے
اِس کا فکر کیا؟

اِستقبال

کا تخیل زندگی ہے! اِسی سے یہ اوراق نسبت قریب
رکھتے ہیں!

شرحِ کلام

جس زمانہ میں "لیلیٰ کے خطوط" شائع ہو رہے تھے اور پڑھنے والے دلچسپی کے ساتھ ان کو پڑھ رہے تھے میرے اکثر احباب نے مجھے اِس امر پر متنبہ کرنا ضروری سمجھا کہ "لیلیٰ" کا طرزِ بیان بہت بے حجاب ہے اور اعتدال کی حد سے گذرا ہوا بعض نے تو یہ بھی کہا کہ "لیلیٰ" کی یہ حرکت کہ وہ مذہب اور انسانیت کے بہترین مسلمات کیساتھ کھیلتی ہے۔ اور شوخیاں کرتی ہے قطعاً غلط ہے۔ میں نے اس وقت ان احباب سے جو عرض کیا تھا وہی اب عرض کرتا ہوں۔ یعنی ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

"لیلیٰ کے خطوط" میں جو داستان میں بیان کرنا چاہتا تھا۔ اس کیلئے موزوں طرزِ بیان وہی تھا جو "لیلیٰ" نے اختیار کیا۔ عورت کی مظلومیت کا افسانہ ہندوستان کے ماحول میں کسی شریف گھر کی بیٹی یا بہو کی زبان سے بیان ہوتا ممکن نہ تھا لامحالہ ایک بازاری عورت کے قلم سے وہ عبرت انگیز حقائق بیان کرانے پڑے جن کو ذرا کم بے حجاب اور زیادہ سنجیدہ طرزِ بیان بے اثر اور بے معنی کر دیتا۔ جو نوک خار میں چاہتا

تھا کہ ان موٹی کھالوں میں چھپے جن پر معمولی چٹکیوں کا کبھی کوئی اثر نہیں ہوتا وہ نوک خار سنجیدگی اور اعتدال کی حدود میں اکثر بے اثر رہتی ہے۔ میں حقیقت میں مجبور تھا کہ "لیلے" کے قلم کی نوک سے ان موٹی اور سخت کھالوں میں سوراخ کراؤں۔ اپنے مقصد میں کسی حد تک مجھے کامیابی ہوئی۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکیں گے جنہوں نے "لیلے" کے خطوط کو محض اسکی ادبی چاشنی کی خاطر نہیں بلکہ اس مقصد اعلےٰ کو پیش نظر رکھ کر پڑھا ہے جو لیلے کے قلم کی روانی میں میری ساری داستان گوئی کی روح رواں ہے۔ وہ ایک عورت کے خونچکاں کفن کے چند دھبے تھے جن کا عکس ان خطوط میں پیش کیا گیا۔

یہ روزنامچہ بھی اسی قسم کی ایک کوشش اور ایک قلمی تصویر ہے۔ جس میں عہد جدید کے ایک ہندوستانی نوجوان کی معنوی کیفیات کو بے نقاب کرنے کے چند پہلو پیدا کئے گئے ہیں۔ محض ادبی نقاشی نہ "لیلے کے خطوط" کا مقصد تھا نہ روزنامچہ کا ہے۔ بس جو لوگ سطحی طور پر ان اوراق کی ادبی خوبیوں کی داد دیں اور ان نقوش کی معنوی اہمیت پر نظر نہ کریں ان کی طرف سے مجھے داد ملی بھی تو کیا۔ میرے نزدیک وہ "تحسین ناشناس" ہے۔

اگر میرے ادعا کو خود بینی پر محمول نہ کیا جائے تو اتنا ضرور عرض کروں کہ "روزنامچہ" کا ایک حرف بھی محض زور قلم کا مظاہرہ کرنے کیلئے نہیں لکھا گیا۔ میرا یہ "روزنامچہ نگار" ایک تعلیم یافتہ اور دولتمند نوجوان ہے۔ بے فکرا۔ کھلنڈرا۔ وہ ہر حال میں ــــ روتے ہوئے ہنستے ہوئے۔ بگڑتے ہوئے جھنجلاتے ہوئے۔ غصہ میں، مرتے ہوئے عشق میں، عیاشی میں، مے نوشی میں، یاروں کی صحبت میں بمبئی کے کٹم خانوں میں، تنہائی

کی راتوں میں، وصل کی شب میں، اختر سے گفتگو یا مولانا یا میر صاحب سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے ـــــ ہر حال میں جو کچھ لکھتا ہے۔ جو نقش کاغذ پر بناتا ہے وہ ہر نقش اِس کی معنوی کیفیات کا حامل ہے ـــــ متلاطم کیفیات، جنہوں نے اِس کی زندگی کا لنگر توڑ دیا ہے! مختصر یہ کہ ان اوراق کی چادر میں چند مقاصد اور حقائق لپٹے ہوتے ہیں۔

ایک ایسے اِنسان کی زندگی کی معنوی حقیقت بیان کرنے کے لئے جس نے مذہب، اخلاق اور جذبات کی تمام حدود کو توڑ ڈالا ہو۔ طرزِ بیان بھی اُن حدود کے اندر محدود نہیں رہ سکتا۔ بعض اوقات کلام کی سنجیدگی مطالب کا خون کر دیتی ہے۔ اور اکثر مشاہدہ حق کے لئے بادہ و ساغر کی بے حجابیاں ناگریز ہوتی ہیں۔

اس تمہید کے بعد چند الفاظ میں عرض کر دوں کہ میرا موضوع کیا ہے؟ دورِ جدید کے وہ نوجوان جو تعلیم یافتہ کہے جاتے ہیں اور جو زندگی کی کشمکش سے فارغ ہو کر اپنے جذبات اور محسوسات کی زنجیریں کھول دیتے ہیں ہمہ تن ایک جہل مرکب بن جاتے ہیں۔ اور زندگی کے مسلمات سے بے نیاز اور بے خبر ہو کر اپنے لئے جہل مطلق کی ایک نئی دنیا بنا لیتے ہیں۔ اِس بے علمی کے ساتھ ساتھ جس کا نام ہمارے ملک میں "تعلیم" رکھا گیا ہے۔ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے مرکز ثقل سے ہٹتی جاتی ہے۔ اِس کا توازن ختم اور اس کی زندگی میں ایک خوفناک انتشار پیدا ہو رہا ہے صحیح تربیت کے بغیر ایک ایسی تعلیم جو مشرق و مغرب کے بہت سے علوم کا ایک نامکمل اور غیر مرتب مرکب ہو یا تو ایسے جانور پیدا کرتی ہے جو کسی نہ کسی طرح دو وقت کی روٹی کماتے ہیں۔

اُدھر جاتے ہیں۔ یا ایسے نوجوان پیدا کرتی ہے جو عقل اور مذہب دونوں سے برگشتہ ہو کر زندگی کا مقصد صرف اتنا جانتے ہیں۔ کہ اونٹ جذبات کی لگام ڈھیلی چھوڑ دیں اور جوانی کے گرم خون کو اور بھی زیادہ گرم کر کے دوڑنے دیں وہ مذہب کی رہنمائی سے محروم رہتے ہیں۔ اس لئے داعیان مذہب ان کے حال پر نظر ہی نہیں کرتے۔ نہ ایسا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان "حاملانِ شریعت حقہ" کو اس حقیقت کا کچھ علم نہیں کہ مسلمانوں کی اس نسل میں جو تیرہ سو برس پہلے پیدا ہوئی تھی اور اس نسل میں جو اب پیدا ہو رہی ہے اور دُنیا کے انقلابات کی گود میں پرورش پا رہی ہے، کس قدر فرق اور بُعد ہے۔ وہ کہتے ہیں ـــــ ہمارا یہ مذہبی پیشوا ـــــ کہ جب کتاب میں لکھنے والا یوں لکھ گیا تو پھر یونہی صحیح ہے اگر وہ کتاب چھ سو برس پہلے لکھی گئی یا نو سو برس پہلے تاہم اس کا "حکم" زمانہ کے فصل و بُعد پر یکساں حاوی ہے اور حاوی رہے گا! اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ ایک مسجد کے ٹوٹے ہوئے لوٹے کے متعلق بھی اجتہاد نہیں کیا جا سکتا۔ دُنیا کچھ سے کچھ ہو جائے عقل اور سائنس کی طاقتیں انسانوں کو مشین بنا دیں اور زندگی کا نقشہ بدل ڈالیں۔ لیکن جو لکھا ہے وہی لکھا رہے گا! نوجوانوں کے سامنے زندگی کے نئے نئے حقائق مغرب کی تعلیم پیش کرتی ہے۔ وہ ان حقائق کو قبول کرنے میں کہیں ان کے اور اپنے قدیم عقائد کے درمیان توازن قائم نہیں کر سکتے۔ اور بالآخر بھٹک جاتے ہیں۔ اہل مغرب کی خود فریبیاں اور خود مختاریاں ان کو مذہب سے بآسانی منحرف کر دیتی ہیں اور پھر ان کی کشتی ایک ایسے متلاطم سمندر کی ہواؤں اور موجوں کے حوالے ہوتی ہے جس کی سطح پر بڑے بادبان روئی کے گالوں کی طرح اُڑتے رہتے ہیں دوسری طرف مغربی تعلیم جو ان جوانوں کو ملتی ہے اس کا یہ حال ہے کہ وہ بی اے یا ایم اے اور ڈاکٹر اور علامہ تو

پیدا کردیتی ہے مگر انسان پیدا نہیں کرسکتی سب کچھ اس تعلیم سے حاصل ہوتا ہے سوائے علم کے چند صفحے تاریخ — وہ بھی اپنے نہیں — چند صفحے جغرافیہ کے، چند قاعدے ریاضی کے، چند مبادی سائنس کے، دو ایک کتابیں انگریزی ادب کی۔ ایک دو رسالے اردو فارسی یا ہندی کے — یہ نسخہ ہے "کوفتہ بیختہ، آمیختہ، بنوشند" اس نسخہ کی دوائیں معدہ سے حلق تک بھری جاتی ہیں۔ پھر ان نوجوانوں کو ایک سیاہ چغہ کاندھوں پر ڈالنے کیلئے ایک سپاٹ مثلث سر پر رکھنے کے لئے عطا کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے زندگی کی کشاکشی کا مقابلہ کرنے کیلئے نئے سپاہی تیار ہوتے ہیں۔ قصور کس کا ہے؟ کسی کا ہو، مگر ان غریب نوجوانوں کا تو یقیناً نہیں ہے، جنکو کالجوں میں اس طرح پیسا، گھولا اور چھانا جاتا ہے کہ جب وہ کالجوں اور اسکولوں سے فارغ ہوکر نکلتے ہیں تو ان کو آنکھوں سے نظر نہیں آتا، دماغ معطل ہوتے ہیں۔ اور کمر ہر ٹیڑھی! پھر وہ دونوں طرف سے ٹھوکریں کھاتے ہیں، مذہب والے ان کو مردود ملعون کہہ کر دھتکارتے ہیں اور دنیا والے ان کو دو وقت کی روٹی کمانے نہیں دیتے ہر طرف سے تنگ آکر وہ یا تو مذہب والوں کی خامیوں کو مذہب سے منسوب کردیتے ہیں۔ اور دہریہ اور منکر ہو جاتے ہیں، یا تعلیم دینے والوں کے تمام عیوب کو علم سے منسوب کرکے معاشیات و اقتصادیات کے موجودہ نظام سے بغاوت کرتے ہیں اور سوشلزم کے جھنڈے کے نیچے زندگی کا ایک نیا نقشہ بنانیکی کوشش کردیتے ہیں، مذہب اور دنیا کی مسلمہ اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہوکر وہ بے تکلف اپنے تمام اضطراری جذبات کی کارفرمائی کو زندگی کا مقصود قرار دے لیتے ہیں۔ اور یوں اس انتہا یا اُس انتہا پر اپنی زندگی کو ختم کرتے ہیں۔

ان اوراق میں جو نقوش پیش کیے جارہے ہیں۔ وہ ایسے ہی نوجوانوں میں سے ایک

نوجوان کی معنوی زندگی کا عکس ہیں۔ ایک خاص نکتہ جو توجہ کے قابل ہے شخصی اجتہاد کا وہ غلبہ ہے جو "روزنامچہ نگار" کے ہر قول و فعل سے ظاہر ہوتا ہے وہ دوسروں کے بنائے ہوئے اصولوں اور معیار کا پابند ہونا گوارا نہیں کرتا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں سیاست ہو۔ یا اخلاق، یا مذہب، وہ اپنے لئے اپنے ہی معیار پر ہر چیز کو جانچتا ہے اور کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ کہ دنیا کیا کہے گی، یہ اس کا بیخوف آزاد اور غیر متوازن اجتہاد اس کو ہر سمت میں دوڑاتا ہے اور کسی سمت میں قرار نہیں لینے دیتا۔ وہ اپنے نفس کو ہر پابندی سے آزاد اور اپنی ہر خواہش کو بے لگام رکھنا چاہتا ہے، وہ دنیا سے ہر بہتر چیز اپنے لئے حاصل کرنا چاہتا ہے دینا کچھ نہیں چاہتا۔ کامیاب ہونا چاہتا ہے۔ بغیر کوشش کے اڑنا چاہتا ہے۔ بغیر پروں کے اور جب بہت سے امکانات غیر ممکن ثابت ہوتے ہیں۔ تو جھلاتا ہے بگڑتا ہے اور کدال لیکر کبھی مذہب کے محراب و منبر پر حملہ کرتا ہے۔ کبھی تمدن کے میناروں پر یورش، یہ اس کا حال ہے یہ اس کی معنوی زندگی ہے یہ کشاکش ہے جس میں وہ مبتلا ہے۔ اپنی مجبوریوں کو محسوس کر کے وہ موت کا بھی مقابلہ کرنا چاہتا ہے اور خودکشی کا ایک نیا فلسفہ پیش کر کے موت کے مقابلہ میں اپنی آزادی و خود مختاری ثابت کرنیکی کوشش کرتا ہے اسطرح کی زندگی قدامت کے خلاف وہ اعلانِ جنگ اور بغاوت کرتا پھرتا ہے۔ کم نظر اسکو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں مگر وہ اس کا صرف ظاہر دیکھتے ہیں۔ اس کے باطن کو نہیں دیکھتے۔ ان طوفانوں کو نہیں دیکھتے۔ جو اس کے اندر برپا رہتے ہیں!

اگر آپ ان اوراق کو پڑھتے وقت بین السطور بھی دیکھتے جائیں گے تو آپ بآسانی معلوم کر سکیں گے کہ باوجود اس بغاوت کے جس کا علم یہ باغی بلند کئے ہوئے ہے کبھی کبھی جوہر اصلی کی ایک جھلک اسکی زندگی میں نظر آتی ہے جس طرح شب کی تاریکی میں

اور جنگل کے کسی تاریک کونے میں ایک گرگِ شب تاب کی چمک مثلاً عورت کے متعلق وہ شدت کے ساتھ اپنی خود غرضانہ نفس پرستی کا اعلان کرتا ہے۔ لیکن اپنی تمام عیاشی اور عیش پرستی میں جب کبھی محبت کی ایک لرزش اس کے اندر پیدا ہوتی ہے تو وہ دنیا کا باغی ایک جھٹکا محسوس کرتا ہے اور اپنے میدانِ جنگ میں بڑھتے بڑھتے یکایک رُک جاتا ہے۔ نفس کی اس خود مختاری کے اس زرہ بکتر کے نیچے ایک کمزور نقطہ موجود ہے۔ جوہر اصلی کی ایک چنگاری باقی ہے جو دل کے کسی تاریک گوشے میں دبی پڑی ہے۔ لیکن "مذہب" کے ٹھیکیدار ایک طرف اور عقل کے علمبردار دوسری طرف ــــ دونوں میں کوئی اس چنگاری کے وجود کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ محض سطح کو دیکھ کر فیصلے اور فتوے صادر فرماتے ہیں طبیب بخار کا علاج کرتا ہے اور دن میں چار چار دفعہ نسخے بناتا ہے۔ مگر جن اسباب کا بخار ایک ظاہری نتیجہ ہے۔ ان کی جستجو نہ کرتا ہے نہ ایسا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ پھر جب مریض کو کسی طرح شفا نہیں ہوتی تو بہت حیران ہوتا ہے کہ یہ بات کیا ہے۔ اپنی بدعقلی کا اسے خیال بھی نہیں آتا الزام رکھتا ہے مریض پر!!

مجھے کچھ زیادہ اُمید نہیں کہ میرے یہ اشارے سونے والوں کے دماغ میں گھُس کر ان کے خراٹوں کو بند کر سکیں گے، لیکن اگر سُننے والوں کے کان بہرے ہوں تو اس کے کبھی یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ بولنے والوں اور کہنے والوں کی زبان بھی گنگ ہو جائے۔ ابھی تو اس گفتگو کا آغاز ہے۔ "لیلےٰ کے خطوط" اور "روزنامچہ" کی داستان ابھی باقی ہے جو اس سلسلہ کے آئندہ اقساط میں پیش کی جائے گی۔

عبدالغفار

۱۸ فروری سنہ ۱۹۲۹ء

صبح ۵ بجے سویا، دو بجے سہ پہر کو جاگا۔ رات بھر ناچ دیکھتا رہا تھا اور تھوڑی تھوڑی پیتا بھی رہا تھا۔ یاروں کی محفل میں اگر نہ بیٹھئے تو عیش گونگا بہرا، لنگڑا اپاہج ہو جاتا ہے! ....

یہ کون تھیں جو رات میرے قریب بیٹھی ہوئی تھیں؟ سنتا ہوں کہ کوئی نئی آئی ہیں خاصی دلفریب ہیں عمر تو بہت کم معلوم ہوتی ہے ابھی چھوکری پن چھوپا گیا رہا ہے۔ لیکن شرماتی کس قدر ہیں۔ گھنٹوں میں نے سر ٹپکا مگر اللہ کی بندی نے کھل کر بات ہی نہ کی اجی شرم ورم تو کیا میں سمجھتا ہوں بہت چالاک اور پُرفن ہوں گی یہ ابتدائی شرم بھی گویا ایک پینترا تھا! وہ سگریٹ جو ہاتھ سے گرایا وہ بھی ایک ترکیب تھی کہ میں اس کو اٹھا کر پیش کروں اور ان کی طرف توجہ کروں۔ اللہ بچائے عورت کے چلتروں سے کیسی شکر چڑھی ہوئی گولیاں ہیں اندر سے کڑوی باہر سے میٹھی! بلیوں کے پنجے —— نرم بالوں کے اندر چھپے ہوئے خوب دیکھ لیا ان سب کو! استاد باقی نے کیسا کیسا نچا ناک چنے چبوا دئے بی مشتری نے کیا کیا مجھکو لے دئے۔ دو برس تک کیسے کڑوے گھونٹ پلائے۔ روپیہ بھی دو۔ خوشامدیں بھی کرو۔ گالیاں بھی سنو جوتیاں بھی کھاؤ دنیا میں اپنی ناک بھی کٹاؤ روتے روتے مرجاؤ مگر پتھر میں جونک نہیں لگتی! خدا ہی بچائے ان جادوگرنیوں سے اب ذرا ان بی "لیلےٰ" کے رنگ بھی دیکھنے ہیں بات ہی نہیں کرتیں۔ بیٹھی ہیں میرے پاس مگر بولتی نہیں بچاری! جلتا ہوا سگریٹ ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا —— گویا اتفاقیہ ایسا ہوا، جی ہاں! خوب سمجھتا ہوں ایسی ننھی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں جان کر گرایا۔ تاکہ میں

اس کو اُٹھا کر ان کی طرف متوجہ ہو جاویں۔ اکیا میں ان ترکیبوں کو جانتا نہیں۔ بگمان زید کی طرف کھینچیں اور تیر لگے بکے کے سینہ پر!۔۔۔ ان کو بھی دیکھنا ہے۔ ابھی ذرا نو گرفتار ہیں۔۔۔ میر صاحب تو کہتے تھے کہ ان کو اِس شہر میں آتے آٹھ ہی دن ہوئے ہیں۔ مگر اپنے فن کے سب امتحان پاس کر کے آئی ہوں گی ان قبروں کے مردوں کا صحیح حال تو صرف دوزخ کے فرشتوں کو ہی معلوم رہتا ہے، خیر حال جو کچھ بھی ہو چیز بری نہیں۔۔۔ میں نے دیکھا مات دس پانچ اور بھی اِس طرف نشانہ باندھے ہوئے تھے۔ بڑا ہی حریص ہوتا ہے جسے مرد کہتے ہیں! عورت کے معاملہ میں کبھی بس نہیں کہہ سکتا۔ جو مل جائے۔ جہاں مِل جائے! کچھ نہیں تو آنکھیں ہی سینک لیگا۔ اور ہے بھی یہ کہ دنیا میں آخر عورت کے وجود کی اِس کے سوا اور غرض ہی کیا ہے "طلب" مرد کی ہے اور "مطلوب" ہیں! باغوں کے پھول بھی تو اسی لئے دامن میں بھرے جاتے ہیں کہ وہ حسین ہیں اور معطر! ان کی نوعِ یکسر "مطلوب" ہے فطرت کے تقاضوں کو نہ قانون باندھ سکتا ہے نہ مذہب۔ وہ ہمیشہ آزاد ہی رہے اور آزاد ہی رہیں گے۔

مرد مرد ہی رہے گا اور عورت عورت ہی

---

۲۵ فروری ۱۹۲۹ء

میر صاحب کو "لیلے" کے گھر بھیجا تھا۔ میں نے کہا ذرا خبر تو لائیں کہ رنگ کیا ہے۔ کتنے کتنے پانی میں ہیں۔ منزل دور ہے یا قریب! کتنا دوڑائیں گی اور تھکائیں گی۔۔۔ مگر میر صاحب تو یہ خبر لائے کہ وہ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتیں۔

اور جو بات کرتی ہیں تو سو من کی۔ اٹھائے نہ اٹھے۔ پڑھی لکھی بھی معلوم ہوتی ہیں۔ میر صاحب گئے تو مطالعہ میں مشغول تھیں یہ اپنا سا منہ لئے بیٹھے رہے اور وہ مطالعہ میں مشغول رہیں جب میر صاحب نے میر اذکر چھیڑا اور محفل کی ملاقات اور سگریٹ والا واقعہ یاد دلایا تو کہنے لگیں ـــــ جی ہاں! کوئی صاحب بیٹھے تو تھے میں تو یہاں اجنبی اور نو وارد ہوں اور اس کے علاوہ ملنے جلنے کا کچھ شوق بھی نہیں۔ وہ میرے غریب خانے پر تشریف لانا چاہیں تو تشریف لے آئیں! افوہ! یہ دماغ! یہ مزاج! میں نے تو میر صاحب سے کہا تم نرے گدھے ہو صورت سے ڈر گئے "یہ سنجیدگی تو ایک ادا ہے۔ ارے میاں صاف صاف مطلب بیان کیا ہوتا معاملے کر کے آتے ہوتے۔ کوئی الیی راجہ کی بیٹی تو ہی نہیں۔ ہیں تو وہی آخر جو ہیں۔ میر صاحب کہنے لگے! صاحب! مجھے تو پسینہ آگیا۔ وہ بیگم بنی بیٹھی تھیں۔ میں نے جو ہمت کر کے کہا کہ آپ کے حسن کا بہت چرچا ہے۔ تو کیا بتاؤں کیا منہ بنا کر ـــــ جیسے کوئی بازاری لونڈے سے بات کر رہا ہو ـــــ اس نے کہا۔ حسن کو آپ کیا جانیں؟ اندھوں کے سامنے چراغ! آپ لوگ تو اپنی ہوس کو جانتے ہیں، دوسروں کے حسن سے واقف ہیں! آپ حسن کو کمال کے اوپر دیکھتے ہیں اور ہوتا ہے کمال کے نیچے۔ کچھ اور عقل و تمیز کی باتیں کیجیے ـــــ میر صاحب کہنے لگے میں تو یہ لکچر سن کر ٹھنڈا ہو گیا۔ کہتا کیا؟ ـــــ خیر میں نے کہا یہ رنگ بھی دیکھنا ہے۔ ایک دن آئیں تو زیر بہ سرِ فولاد سب فلسفہ دھرا رہ جاتا ہے"

۱۲؍ مارچ ۱۹۲۹ء

کیا کیا سختی ہوئی ہے۔ بارے کل شام تشریف لائیں ـــــ کچھ

بھی کہو۔ عورت تو ذہین اور دلچسپ ہے۔ ایسی سلجھی ہوئی باتیں کرتی ہے کہ میں تو حیران رہ گیا۔ پھر اس کا حسن اور اسکی نوعمری! میں نے بیتاب ہو کر یہاں تک کہہ دیا کہ شام کو روز تشریف لایا کیجئے۔ مگر کیا صاف جواب دیا ہے ظالم نے! کہنے لگی جی ہاں! اگر روز آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہو جایا کروں تو میری جان کھانے والے دس پانچ اور جو ہیں وہ کہاں جا کر سر پھوڑیں؟ میں جائداد مشترکہ ہوں، سرائے کی بھٹیاری ہوں جو مسافر آئے اس کا بستر بچھاتی ہوں، کھانا پکاتی ہوں۔ میں اپنی سرائے چھوڑ کر کہیں باہر جا بیٹھوں تو میرے مسافر کیا کریں؟ آپ اگر میرے حال پر مہربان ہیں تو کبھی کبھی ضرور حاضر ہوا کروں گی" ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہے مگر اس کی ہنسی میں ایک درد جھلک ہے جیسے درد کی۔ جیسے بیمار ہنستا ہے۔ خدا جانے ہے کون یہ عورت! اس قبیلہ سے تو یقیناً نہیں ہے میں نے کچھ دریافت کرنا چاہا تو صاف اُڑ گئی۔

---

۱۴ مارچ سنہ ۱۹۲۹ء

بہت بلایا، نہیں آئیں کہہ دیا کہ فرصت نہیں ہے۔ میں نے دو تین خط لکھے۔ جواب ملا "خط لکھنے کی فرصت ہوتی تو خود ہی نہ حاضر ہو جاتی"!!

عجیب عجیب حرکتیں کرتی ہے۔ یار لوگوں نے تو مجھے طعنے دینے شروع کر دیئے ہیں۔ پھسل پڑے۔ ریشہ خطمی ہونے لگے۔ پھسلنا چاہتے ہو۔ یہ لوگ سمجھتے ہی نہیں کہ اگر کوئی مرد کسی عورت کو پسند کرے۔ تو اس کے معنی عشق و الفت کیوں سمجھے جائیں؟ عشق تو ایک بازاری اصطلاح ہے لغو اور بے معنی عیش کا دوسرا اصطلاحی نام

در حقیقت عشق ہے۔ واللہ شاعروں کا عشق تو ایک عذاب ہے۔ لاحول ولا اصل
چیز عورت ہے اور مرد کی عورت طلب فطرت۔ میرا کوئی دوست کبھی میرے سامنے آکر
کہتا ہے کہ "میں فلاں عورت پر مرتا ہوں" تو میں صاف کہہ دیا کرتا ہوں کہ دماغ کا علاج
کیجئے۔ شئے لطیف کی کمی معلوم ہوتی ہے یا خودکشی کر لیجئے۔ میرے کان کیوں کھانے آ
گئے۔ میاں اختر ایک دفعہ کسی چھوکری پر عاشق ہو کر ہائے ہائے کرتے میرے گھر آئے۔ لگے ہچکیوں
سے رونے۔ میں نے کہا کچھ باولا ہو گیا ہے سالو کہیں کا۔ اگر عشق بازی ہی کرنا چاہتا ہے تو جو
عورت آسانی سے حاصل ہو سکے۔ اس سے کر لے عشق بازی دس پانچ مہینے۔ اگر شریفوں کی
سی عشق بازی کرنا ہے۔ اور جو عورت نہ مل سکتی ہو اس کے پیچھے ریں ریں کرنے سے کیا
حاصل ــــ چل بھاگ یہاں سے ــــ تیرا معدہ خراب ہے۔ یا جگر ماؤف ہے ــــ
اختر میاں اس دن مجھ سے بہت خفا ہو گئے اور جب تک مبتلائے عشق رہے خفا ہی
رہے۔ جب وہ بھوت سر سے اترا تو پھر ایک دن آئے۔ شرماتی ہوئی ہنسی ہنستے
ہوئے ارے بھائی معاف کرو۔ لاحول ولا۔ کس خبط میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میں! لعنت
بکار شیطان! اس چھوکری نے تو ناک چنے چبوا دئے۔ خیر جھگڑا کٹا ــــ اب
تو سنتا ہوں اس کی شادی ہونے والی ہے۔ پہلے تو میرے ہی پاس پیام آیا تھا کہ
شادی کر لو۔ میں نے کہا لاحول ولا قوۃ کہاں عشق کہاں نکاح! عشق بازی کہاں اور نکاح
کہاں! میں نے کہلا بھیجا کہ نیک بخت جہاں تمہارا دل چاہے شادی کر لو میری عشق
بازی نکاح کی خشکی کا تحمل نہیں کر سکتی۔ کیوں کیسی کہی ــــ پھر کہنے لگا۔ یار
سنتے ہیں ایک نئی آئی ہوئی ہیں۔ تم نے تو خوب ربط ضبط پیدا کر لیا ہے۔ ہمارا
بھی کچھ حصّہ ہے یا ــــ میں نے کہا باؤلے ہوئے ہو۔ میرا ہی حصّہ کہاں ہے جو

تمہارا ہو، وہ تو کچھ عجیب ہی ہے ـــــ

۲۱ مارچ ۱۹۲۹ء

بہت بُرا دن گزرا، مولانا خیر الزماں صاحب خدا جانے کہاں سے (ہر بلا تے کہ آسمان آید) نازل ہو گئے۔ پھر جب وہ آتے ہیں تو قطب بن کر جم جاتے ہیں! ان کی عرفانیات کا ریج ٹپاٹپ شروع ہوتا ہے۔ گویا انسان ٹپکتی ہوئی چھت کے نیچے بندھا بیٹھا ہے! حسب معمول مولانا کے پند و نصائح کا پٹارہ کھل گیا، یہ گناہ وہ گناہ۔ یہ صغیرہ۔ وہ کبیرہ، دوزخ، روز فرشتے اور منکر نکیر! غرض ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر فرماتے میرا ناک میں دم کر دیا کہنے لگے میاں! اب تم شعور کی عمر تک پہنچ گئے ہو۔ اب ذرا اپنے ضمیر سے محاسبہ کیا کرو۔ گناہ کی زندگی کا نشہ شروع میں تو بہت خوشگوار ہوتا ہے مگر آخر میں تباہ کار ہو جاتا ہے۔ "میرے بھائی!" یہ مولانا کا تکیہ کلام ہے ـــــ میرے بھائی! کب تک غافل رہو گے ـــــ پھر انہوں نے نہ جانے کتنی آیتیں اور حدیثیں بیان کر ڈالیں ـــــ میں تو گناہ کا نام سنتے سنتے تھک گیا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا انسان کی زندگی میں گناہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ گناہ! گناہ!! گناہ!!! سوتے جاگتے۔ کھاتے پیتے ہنستے، بولتے گناہ ہی گناہ ہے پانی پیو تو گناہ، روٹی کھاؤ تو گناہ مولانا ہمہ تن ثواب اور ہم ہمہ تن گناہ! میں نے بھی آخر جل کر کہا کہ حضرت! آپ اپنے مذہب کا پٹارہ تو میرے سامنے کھولئے نہیں۔ یہ تو بازی گر کی جھولی ہے۔ میں آپ کے ڈھکوسلوں کا قائل ہی نہیں جو بات آپ کہیں ذرا ساتھ ہی ساتھ اس کو سمجھاتے بھی جائیں۔ آپ کہتے ہیں مرد کا بغیر نکاح عورت کے پاس جانا حرام

ہے کیوں جناب؟ صرف اسی لیے کہ مذہب نے مرد اور عورت کے تعلقات کے متعلق ایک قانون بنا کر ہمارے سر پر رکھ دیا ہے لیکن نکاح میں ہے کیا سوائے ایجاب و قبول کے پھر اگر ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان ایجاب و قبول ہو کر شرعی اصطلاحات نہ ہوں تو نکاح بغیر بھی دونوں کا جنسی تعلق کیوں جائز نہیں؟ اور فرض کیجئے کہ کوئی شخص آپ کی مصطلحات اور قانونی ڈھکوسلوں کو مانتا ہی نہ ہو تو پھر آپ اپنا قانون اس کے حلق میں کیونکر اتار سکتے ہیں جو شخص آپکے جہنم ہی کے وجود کا منکر ہو اس پر خالدین فیھا ابداً کا کیا اثر؟ جناب مولانا! میں نے کہا مرد عورت کے لئے ہے اور عورت مرد کے لئے، اس لئے نہیں کہ ان کو مذہب ایک دوسرے کا لباس بناتا ہے بلکہ اس لئے کہ فطرت مجبور کرتی ہے کہ مرد عورت کی طرف آئے اور عورت مرد کی طرف جائے! زندگی کا ایک سلجھا ہوا سیدھا سادا مسئلہ ہے جس میں مذہب نے سینکڑوں گرہیں لگادی ہیں مولانا کہنے لگے اگر فطرت ہی کے پابند ہو تب بھی تو اس نے کوئی حد اعتدال مقرر کر دی ہے اس کا لحاظ کرو۔ میں نے کہا بیشک! لیکن اگر اعتدال کی حدود سے تجاوز کیا بھی جائے تو اسکی سزا فطرت خود دیتی ہے آپ کیوں اپنا دوزخ جنت لے کر گھسے پڑتے ہیں؟ فطرت کے نمائندے آپ کہاں سے بن آئے؟ فرمایا کہ دین فطرت ہے اور دین کے نمائندے ہم ہیں۔ میں نے کہا واہ صاحب کیا دین ہے اور کیا اس کے نمائندے ہیں۔ فطرت کا سارا ڈھانچہ توڑ مروڑ کر اس کی صورت ہی مسخ کر ڈالی۔ وراثت کا ایک نیا ڈھانچہ بنا کر کھڑا کر دیا۔ اس ڈھانچے کو قائم رکھنے کیلئے ازدواج کے قاعدے اور ضابطے مقرر کر دئے۔ عورت مرد فطرت کی فطرت کو پابہ زنجیر کر دیا۔ خالص فطری جذبات کو کیا سے کیا بنا دیا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ ہوا کہ فطرت اور مذہب میں مقابلہ ہونے لگا۔ دونوں ایک دوسرے

کے حریف بن گئے۔ فطرت اپنے تقاضوں کو چوری چھپے پورا کرنے لگی۔ مذہب کے دامن میں بیاد تک کے سانپ بچھو پرورش پانے لگے ــــ اور آپ ہیں کہ حرام و حلال کی بحث میں سر کھپائے جاتے ہیں ــــ اور فطرت مذہب کے قید و بند سے آزاد ہو کر زمین کے نیچے سرنگیں بنانے لگی صاف اور ستھری حیوانیت کو آپ نے انسانیت سے خارج فرما کر ایک خالی ڈھول بجانا شروع کر دیا۔ زہد و تقویٰ کی نئی نئی اصطلاحیں گھڑلی گئیں۔ اس حیوانیت کے پاؤں میں جو جزو انسانیت ہے آپ نے بیڑیاں ڈال دیں ــــ عجب قسم کی یہ تنظیم ہے ــــ حضرت مولانا بہت تحقیرانہ طریقہ پر میری صورت دیکھ دیکھ کر مسکراتے جاتے تھے۔ مگر میں بھی کہے ہی گیا جو منہ میں آیا۔ عجب قسم کی یہ تنظیم ہے۔ مولانا غذا سامنے رکھی ہے۔ بہت آسانی سے انسان اس کو اٹھا کر کھا سکتا ہے۔ مگر آپ نے اسکے دستر خوان سے منہ تک لے جانے کیلئے ہزاروں قاعدے اور ضابطے بنا ڈالے۔ پہلے نوالہ یوں بناؤ۔ منہ اس طرح چلاؤ گلی اس طرح کرو۔ ہاتھ اس طرح دھوؤ۔ ڈکار اس طرح لو ــــ فطرت کے معمولات تصنعات کی زنجیروں میں باندھ دئے گئے ــــ کام آسان تھا۔ اسکو مشکل بنا دیا ــــ واہ رے مذہب! مولانا فرمانے لگے: تیرا دماغ خراب ہے۔ مذہب کو نہیں مانتا مگر عقل کو تو مان! میں نے کہا جناب! عورت مرد کی مملوکہ و مقبوضہ تھی فطرت نے مرد کو اس کا مالک اور آقا بنایا تھا آپ نے اتنے حقوق اس کو دے ڈالے ــــ کہ وہ مرد کے تفوق ہی سے منکر ہو چلی۔ آپ ہماری جائداد چھین رہے ہیں ہم کو بیدخل کئے دے رہے ہیں اور گناہ گار بھی ہمیں ثابت کرتے ہیں۔ فطرت نے عورت کی قیمت صرف اتنی مقرر کی تھی کہ ــــ

بڑھا کر جو اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

لیکن آپ نے مینا کو میخانہ کا حصہ دار بنا دیا۔ وہ ہمارا کھلونا تھی آپ نے اس کو ہماری ہی "نصف" بنا دیا۔ واہ جناب! پھر آپ چاہتے ہیں کہ ہم شکایت بھی نہ کریں! مذہب نے مرد پر یہ ظلم ڈھایا کہ عورت کو اس سے چھین کر غلام کو آقا کے ہم پلہ بنا دیا اور اب تو شدید حکم یہ ہے کہ اس کو نظر اٹھا کر بھی مت دیکھو! اس زبردستی کی پابندی کا نام آپ نے رکھا "زہد و تقویٰ"! یہ آپ کی قانونی اصطلاح ہے! میری ہی بلی اور مجھ ہی سے میاؤں! یہ حالت آپ نے مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی بنا دی۔ ان کو حقوق دے گئے اور ہم سے چھینے گئے آپ کی اس قانون سازی کو حضرت! دور ہی سے سلام!

کوئی اور ہوتا میری جگہ تو مولانا اس کے سر پر عصا کھینچ مارتے مگر میری باتوں کو وہ بادلی سمجھا کرتے ہیں ۔۔۔ اس لئے اکثر اس قسم کی بحث اپنی عادت کے موافق حسب ذیل دلائل میں سے کسی ایک یا سب دلیلوں پر ختم کر دیا کرتے۔ یعنی جس دن میں ان کو زیادہ نہیں گرماتا تو وہ محض "احمق" "پاگل" "خبطی" کہہ کر ٹال جاتے ہیں۔ لیکن جس دن ذرا حرارت آ جاتی ہے۔ تو "لاحول ولا قوۃ" "توبہ توبہ!!" "اللّٰہم احفظنا" وغیرہ ان کا خاتمہ کلام ہوتا ہے اور جو بحث نے طول کھینچا اور مولانا کا پارہ بہت ہی زیادہ چڑھ گیا۔ تب تو "لعین" "مردود" "کافر" کی گرج اور کڑک پر گفتگو ختم ہوتی ہے ۔۔۔ آدمی بہت اچھے ہیں مولانا مگر ذرا شے لطیف کم ہے!!

---

۲۹ مارچ سنہ ۱۹۲۹ء

رات بہت سوشن دُمروش کے بعد غریب خانہ پر تشریف لائی تھیں۔ مگر کچھ

اداس اور افسردہ، میں نے کہا تم کو یہ زیبا نہیں، تم تو دنیا میں ہنسنے ہنسانے کے لئے بھیجی گئی ہو۔ ان حسین آنکھوں کو آنسوؤں سے کیا علاقہ؟ کہنے لگیں میرا پیشہ ہنستا ہنسانا ہے۔ مگر میری فطرت غمگین ہے —— حسن ہمیشہ غمگین ہوتا ہے —— اور عشق بھی۔ ہوس البتہ خندہ بر لب ہوتی ہے اور گناہ قہقہے مارتا ہے! —— گناہ! —— سمجھئے یہ بھی گناہ اور ثواب کے الجھیڑے میں الجھی ہوئی ہیں! رات بہت دیر تک ان کو سمجھاتا رہا۔ کہ گناہ اور ثواب کا تخیل انسانوں میں محض بزدلی اور مجہولیت کی نشانی ہے۔ میں نے کہا زندگی کے جس نظم کی بنیاد تخویف و تہدید پر ہوتی ہے وہ آزاد انسانوں کو غلام اور مجہول بنا دیتا ہے۔ جب دل پر ڈر اور خوف کے نقوش ثبت کر دیے گئے تو ضمیر کی آزادی ختم ہوئی۔ اسی کا نام لوگوں نے مذہب رکھ دیا ہے۔ کہنے لگیں مذہب کی تو میں بھی کچھ زیادہ قائل نہیں۔ مگر رسم و رواج کے مطابق نماز بھی پڑھ لیتی ہوں۔ کبھی روزے بھی رکھ لیتی ہوں۔ مجھے تو مذہب سے شکوہ ہے۔ کہ اس نے مردوں کو عورتوں پر مسلط کر دیا۔ یہ تم نے سچ کہا کہ خوف کی بنیاد پر جو تنظیم کی جاتی ہے وہ انسانوں کی انسانیت کو مجہول اور مجبور بنا دیتی ہے وہ نماز نماز کیا ہے جو دوزخ کے ڈر یا جنت کے مزوں کی امید میں پڑھی جاتی ہے لوگ مذہب کی پابندی زیادہ تر دوسروں کو دکھلانے اور مرعوب کرنے یا ملامت اور بدنامی کے خوف سے کرتے ہیں یہ سب یا تو بزدل۔ جھوٹے اور مجہول ہیں یا مکار اور دنیا ساز —— سیاہ اور گھنے ابرو پیشانی کی طرف کھنچے ہوئے بڑی بڑی غزالی آنکھیں معمول سے زیادہ کھلی ہوئی —— اس طرح وہ گناہ اور ثواب کے فلسفہ کی تعریفات سے میری مدارات کر رہی تھیں۔ میں نے کہا ہم تم مذہب کے

تخیل کی کجی کے متعلق تو متفق الرائے معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ تم نے کیا کہا کہ مذہب نے عورتوں پر مردوں کو مسلط کر دیا۔ مجھے تو مذہب سے دشمنی عداوت یہ ہے کہ اس نے مردوں کے مالکانہ حقوق چھین کر عورتوں کو ہمارے سر پر چڑھا دیا ہاں! ہمارا تمام خون پی کر بھی آپ کو شکوہ ہے۔ کہ ہڈیاں باقی رہ گئیں! مذہب کا نام لیکر آپ گویا ماتم کر رہے ہیں۔ کہ عورتیں آپ کے قابو سے باہر ہو گئیں ہیں۔ مذہب سے آپ صرف اس لئے خفا ہیں کہ اس نے آپکی رعایا کو کچھ حقوق دے کر انکے پاؤں کی زنجیروں کو قدرے ہلکا کر دیا ہے اور مجھے مذہب سے یہ شکایت ہے کہ اس نے اپنے قانون کا ہم کو جبراً پابند بنا کر اس قابل نہیں رکھا کہ تم لوگوں سے کافی انتقام لے سکیں! عجب تماشہ ہے۔ ہم دونوں مذہب سے رو گرداں ہیں۔ لیکن دونوں کی رو گردانی کے اسباب جدا جدا ہیں۔ اتحاد میں اختلاف! میں تو یہ کہتی ہوں ـــــ کہنے لگیں ـــــ کہ مرد اور عورت کے قضیہ کا مذہب کی عدالت میں فیصلہ ہی نہ کراؤ اس قضیہ کو فطرت کی عدالت میں پیش کرو۔ مذہب کی قانونی اصطلاح میں گناہ اور ثواب کو گناہ اور ثواب ہی نہ سمجھو۔ آؤ ہم تم اپنے ضمیر اور اپنی عقل سے محاسبہ کریں۔ میں تمہیں بتا دوں کہ میں کیوں اپنے کو تم سے بہتر اور برتر سمجھتی ہوں۔ تم مکار اور بزدل ہو۔ میں نہ مکار ہوں نہ بزدل۔ میرے اندر تم سے بہت کم بچھولیت ہے۔ میں ایک گندہ پیشہ کرتی ہوں۔ لیکن اپنی گندگی کو چھپاتی نہیں نہ اس کو پاکیزہ بنا کر دکھاتی ہوں تم عیاشی کرتے ہو مگر دنیا والوں سے ڈر کر مکاریاں اور حیلہ بازیاں بھی کرتے ہو۔ میں کھلم کھلا اپنے گھر بیٹھ کر اعلان عام کے ساتھ حسن فروشی کرتی ہوں۔ مگر تم مجھے جب اپنے گھر بلاتے ہو تو رات کی تاریکی میں بند گاڑی کے اندر۔ برقعہ اڑھا کر پھر مجھے لے کر بیٹھتے ہو تو گھر کے دروازے بند کرا کے ـــــ تمہارے دل میں دنیا والوں کا خوف اور

رسم و رواج کی غلامی موجود ہے۔ میں اس سے آزاد ہوں۔ اگر میرے تمہارے تعلقات مذہب کی اصطلاح میں گناہ بھی ہیں۔ تو تمہارا گناہ میرے گناہ سے بدرجہا بد تر ہے۔ اس لئے کہ اس میں بڑا حصّہ مکر اور فریب کا ہے!

اِن ہی باتوں میں بلا مبالغہ ساری رات گزر گئی! کچھ عجیب سی عورت ہے اس کی صورت میری حیوانیت کو مشتعل کرتی ہے۔ لیکن اسکی فلسفیانہ باتیں میرے دماغ کا گودا نکال لیتی ہیں ——— مگر میں حسن صورت چاہتا ہوں۔ میں مرد ہوں مجھے فلسفیانہ نکتہ نوازیوں سے کیا کام! میں جوان ہوں۔ دولت مند ہوں۔ آزاد اور مختار ہوں مبے پرواہ وہ صرف ایک چھوکری ہے ——— حسین اور دلکش۔ میرے نفس کی پیش خدمت ——— میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ آئندہ ملاقاتوں میں گفتگو کے اس پہلو کو درمیان میں آنے ہی نہ دوں گا ——— میری ساری رات کیسی ضائع گئی ——— چھوکری کس قدر چالاک ہے۔

---

۱۸ اپریل ۱۹۲۹ء

اختر۔ محمود۔ ذکی۔ دانش۔ سب کے سب دن بھر جمے رہے بستر سے اُٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ یہ غول کا غول وارد ہو گیا۔ برج جو شروع ہوا تو دوپہر کا کھانا بھی بھاگم بھاگ کھایا کہ پھر جو جمے تو رات کے نو بجے دم لیا۔ نہ سورج کے طلوع کی خبر ہوئی نہ غروب کی! ہم سے بڑا بلو شاہ کون؟ دولت بے حساب فرصت بیشمار فکر صرف اتنی کہ دن میں چار دفعہ بھوک لگتی ہے۔ آفتاب نکلے یا غروب ہو جائے ـــ ہمارے گھر کا چاکر ہے اپنے وقت پر آتا ہے اور چلا جاتا ہے ہمیں کچھ خبر نہیں کہاں سے آیا اور کہاں گیا ـــ جوانی!

جوانی!! جوانی!!! میں تو کہتا ہوں کہ آدمی جوان ہی مر جایا کرے۔ جس دن محسوس ہو کہ عمر کا ضعف اعضا میں پیدا ہونے لگا۔ کچھ کھا کے سو رہے۔ دنیا کو ضرورت صرف جوانوں کی ہے۔ بڈھے تو مادر گیتی کے سینہ پر خواہ مخواہ پتھر کی طرح رکھے رہتے ہیں۔ آسٹریلیا میں بڈھے گھوڑوں کو گولی مار دی جاتی ہے اس لئے کہ مفت کا دانہ چارہ کیوں دیا جائے کوئی ایسا ہی اسٹو انسانوں کے لئے بھی بنایا جائے جوانوں سے جوانی کے سارے کام لیجئے اور جب وہ بڈھے ہو چلیں تو ایک گولی کھلا کر کہیں توپ دیجئے۔ زندگی صرف جوانی ہے بڑھاپا موت کے گھر کی چوکھٹ ہے۔ اس چوکھٹ پر پہنچ کر انسان کیسے کیسے بہانے کرتا ہے کسی طرح چوکھٹ کے اس پار نہ جائے۔ کیا کیا فکریں اور تدبیریں کرتا ہے طبیبوں اور ڈاکٹروں سے رجوع کرتا ہے مقویات اور مفرحات کھاتا ہے بندر کی گلٹیاں اپنے جسم میں پیوست کراتا ہے ان کی معجونیں بنا بنا کر کھا جاتا ہے۔ موتی جواہرات گھول گھول کر پی جاتا ہے۔ دنیا بھر میں بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ کس قدر بیوقوف ہے جانتا ہے کہ ایک دن تو مرنا ہی ہے شنبہ کو نہ سہی۔ یکشنبہ کو سہی مگر سانپ کی چھچھوندر بنکر کچھ دنوں موت کے حلق میں اٹکا رہنا چاہیئے۔ گدھا کہیں کا۔ جوانی ہے مزے کرتا ہوں جب دیکھوں گا کہ رات کو جاگنے سے سر میں درد ہونے لگا سمجھ لونگا کہ تیس مار خانی ہو چکی اپنا بوریہ بستر لپیٹ کر موت کو آواز دوں گا۔ "آجا میں فارغ ہوں۔ دنیا میں جو کچھ اچھا تھا اس سے میری جوانی نے اپنا حصہ ایک ایک رتی وصول کر لیا۔ اب فرصت ہے محفل برخواست ہو گئی۔ آجا!! اور جہاں تیرا جی چاہے مجھے لے جا"۔ اس طرح میں کھیلتے کھیلتے۔ پھولوں کی چادر پہ — کسی مہ جبیں کی آغوش میں — سو جاؤں گا — اس کے بعد کیا ہوگا؟ کچھ بھی ہو مجھے کیا؟

مولانا خیر الزمان تو عاقبت کا دکھڑا لئے بیٹھے ہیں۔ واہ کیا زندگی ہے زندگی میں عاقبت

کے خوف سے مرتے رہو۔ بڑھاپے میں موت کے ڈر سے پڑے کانپا کرو۔ اور جنت اور دوزخ کی فکروں میں بلسورا کرو۔۔۔۔ یہ بھی گویا جینے میں کوئی جلینا ہے۔۔۔۔ روتے ہی رہو روتے جاؤ پیٹتے جاؤ اپنے نصیبوں کو!!

---

۲۲ راپریل ۱۹۲۹ء

وہ مجھ سے خفا ہیں۔ شکایت یہ ہے کہ میں ان کے احباب کو رقیبانہ نظر سے دیکھتا ہوں! چاہتی یہ ہیں کہ ان کا فیض عام جاری رہے وہ بہار حسن لٹکتے جائیں اور میں بھی اپنا حصہ لیتا رہوں بے چون وچرا۔ پرسوں جب وہ تشریف لائی تھیں تو میں نے ان سے اشارتاً کہا تھا کہ ان کے "دیگر احباب" کے تذکرے اور وہ بھی انہی کی زبان سے میرے لئے "فردوش گوش" نہیں ہیں ان کو میرے پاس بیٹھ کر اپنے احباب کے عشق و الفت کی داستانوں کے بیان کرنے میں بہت مزہ آتا ہے میں نے کہا مجھے تو ان قصوں سے معاف رکھئے۔ مجھ سے التفات کیجئے اور دوسروں کی یاد کو گھڑی چھوڑ آیا کیجئے۔۔۔۔ اب بہت خفا ہیں کہتی ہیں تو میرے دوستوں کو اپنا رقیب بنا رہا ہے۔۔۔ گویا کہ وہ میرے رقیب ہی نہیں۔

عجب ہے۔ یہ عورت اور عجیب ہیں اکی باتیں۔ ہدایت فرماتی ہیں کہ تجھے اپنے کام سے کام (تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبٹر تو) تو دوسروں کو دیکھ کر کیوں جلے! پھر ساتھ ہی ساتھ مردوں کی "حیوانیت" پر بھی لعن طعن۔ لیلیٰ کی بجائے کوئی دوسری "آرائش محفل" ہوتی تو میں کہتا کہ حضورِ عالی! حسن کی فریب کاریوں پر یہ غرور تمسخر انگیز ہے! مرد ہر حال میں مرد ہی ہے۔

شیر اپنے شکار میں جنگل کے دوسرے رہنے والوں کو شریک نہیں کیا کرتا۔ سو دل کا قبضہ
ہے اور قوت کاہا ——— مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بڈھا ہو چلا! غصہ آتے ہی بگڑتا
ہوں۔ تیار ہو کر بیٹھتا ہوں کہ آج آئیں تو ذرا مزاج پرسی کروں۔ جب وہ تشریف لاتی
ہیں اور میں موم کی ناک کی طرح پگھل کر رہ جاتا ہوں! کبھی اپنی نسبت کچھ کہنا بھی شروع کیا
تو وہ عجیب طرح بھویں اوپر کھینچ کر۔ آنکھیں نیم باز مسکراتی ہیں اور کچھ ایسے انداز سے میرا مذاق
بنانا شروع کرتی ہیں کہ زچ ہو کر رہ جاتا ہوں ——— ہاں! تو آپ کے دل میں درد ہے

——— آپ کے؟

جی؟ رشک غیر نے آپ کا دل خراب کر ڈالا۔ یہ عیاشی کرتے کرتے عشق کیسا شروع ہو
گیا؟ مجاز سے حقیقت کی طرف پرواز! تصوف کا بہت درجہ ہے جناب مگر سنیئے تو۔ وہ سب
بھی جن سے آپ خفا ہیں۔ اسی حال میں ہیں! مرتے ہیں! دیکھیئے کس کس کا جنازہ اٹھاؤں
کس کس کو کفناؤں ——— اتنی بہت سی قبریں مجھ سے تو کھودی نہ جائیں گی ———
زمین میں خریدے لیتی ہوں۔ قبریں اپنی کھدوا لیں ———
ایک دفعہ دل کے اندر ایک آگ سی لگتی ہے دل کہتا ہے۔ اس عورت کی سزا
یہ ہے کہ محض انتقاماً اس کو بیوی بنا کر گھر میں بند کر دیا جائے ——— یہ خوبرو
تیتری اپنے رنگین پنکھوں پر کس قدر نازاں ہے" ——— پھر جو نظر اٹھا کر دیکھتا
ہوں تو جیسے کسی نے منہ پر ایک طمانچہ مار کر کہا۔ "چپ بے ادب"! پھر جب وہ چلی
جاتی ہیں تو اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہوں۔ دل کہتا ہے۔ "واہ حضرت واہ معلوم شد
بافندگی؟ آپ نے تو ہزاروں کے حسن کو فتح کیا۔ آپکی عیاشی اور حسن پرستی کا تو ڈنکا بجتا
ہے! آپ جوانمرد ہیں، آپ کا حق ہے کہ جس عورت کو چاہیں فتح کر لیں۔ اس عورت سے

آپ کیوں پیٹے جا رہے ہیں"۔ اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہوں اور پھر عہد کرتا ہوں کہ آئندہ ملاقات میں دو چار سخت جھٹکے دیکر دماغ درست کر دوں گا! آئیں تو اب کی دفعہ ساری تیزی طراری نہ بھلا دوں تو لعنت ہے مجھ پر ——— کبھی سوچتا ہوں یہ عورت یوں قابو نہ آئے گی بہت چالاک ہے لاؤ نکاح کر کے پابند کر لوں ——— واللہ جو کہیں مجھ سے نکاح کر لے تو ساری شاعری اور فلسفہ دھواں بن کر اڑ جائے! ——— مگر نکاح کی پابندیاں ——— میرے لئے؟ لاحول ولا، کوئی مرد پابند ہوتا ہے جو ہم ہو جائیں گے؟ دل اُکتا گیا تو عورتوں کی کچھ کمی ہے، چار تک تو بیویاں ہی رکھی ہیں۔ کون بیوقوف کہتا ہے کہ نکاح سے مرد پر بھی اخلاقی پابندیاں عاید ہوتی ہیں، نکاح تو صرف قبضۂ مالکانہ کی شرح توثیق ہے۔ جیسے جائیداد خرید کر عدالت میں اس کی رجسٹری! قیمت نقد یا وعدہ اسی کا نام مہر ہے۔

---

۲ مئی ۱۹۲۹ء

آخری چاہتی کیا ہے یہ عورت! محبت کے نام سے بیزار ہے زرپرست ہے نہیں۔ اسکی تعریف کرو تو چڑتی ہے ——— کسقدر سرد اور خشک ہے! اپنی عیش کی خلوتوں میں مجھے سرد عورت سے کسقدر نفرت ہے۔ ہر مرد کو ہوتی ہے۔ مرد عورت سے ہمیشہ اپنی حیوانیت کا جواب مانگتا ہے۔ عورت اگر بے حس ہو کر اس کی گود میں پڑی رہے تو پھر عیش کہاں؟ ایسی عورت سے تو بہتر مصوروں کے شاہکار اور مرمر کے مجسمے ہیں!! انہیں دیکھ کر خوش وقت ہو لیا کریں۔

اور ہزار شغل ہیں۔ اور ہزار تفریحات ہیں۔ ایک خوبصورت مردے کو گود میں لیکر
کیوں بیٹھے۔ مرد کی اس سے بڑی توہین ہی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ کسی عورت میں طیش
کی گرمی بھی پیدا نہ کر سکے۔ وہ بربط نواز کیا جو ساز کے صحیح تاروں کو انگلی بھی لگا سکے!
گذشتہ ہفتہ دو دن تک میرے پاس رہیں۔ میں نے لاکھ لاکھ پوچھا کہ آپ کا یہ رنگ
کیا ہے ہنستی رہیں اور ہنستے ہی ہنستے دو آنسو بھی نکل پڑے۔ پھر ہنسنے لگیں!
مجھ پر عورت کے آنسوؤں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ صحبت عیش میں تو اس کے
آنسو بے لطفی کا باعث ہو جاتے ہیں۔ مگر "لیلےٰ" کے وہ آنسو جو پرسوں میں نے اس کی
آنکھوں سے گرتے دیکھے ـــــ ان کو اب تک نہیں بھول سکا۔
گویا وہ آنکھوں سے نکل کر میرے دل میں اتر گئے ہیں!! ـــــ مجھے کیا
ہو گیا ہے، لاحول ولا عورت کے آنسو دیکھ کر بے قرار ہو جانا ـــــ یہ بڑھاپا ہے
یا بزدلی! یہی حال ہے تو بس ہو چکی حسن پرستی!!
صبح اختر آئے تھے۔ "لیلیٰ" اسی وقت رخصت ہوئی تھی۔ میں کچھ افسردہ سا
پڑا تھا۔ اول تو اختر مذاق کرتا رہا پھر کہنے لگا "تم پھنس گئے ہو مجھے؟ اور مجھے تو
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برے پھنسے ہو" اس وقت میں نے بھی جو کچھ میرے دل
میں تھا۔ اختر سے کہدیا۔ اس نے بہت ہی سنجیدہ آواز میں کہا۔ "میں تمہارا حال
دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت سے دیکھ رہا ہوں جب سے "لیلیٰ" کی آمد و رفت شروع ہوئی
اب ذرا سنبھل کر قدم بڑھانے یا ہٹانے کا وقت آیا ہے۔ اپنے نفس کا تجزیہ کر کے
فیصلہ کرو کہ تمہارے جذبات محض عیاشانہ ہیں۔ جیسے کہ ہمیشہ ہوا کرتے ہیں۔ یا کچھ
آگے بڑھ گئے ہو؟ اگر تم کو ذرا بھی شبہ ہو کہ تمہارے قدموں کے نیچے سطح ڈھالو ہے

تو یہیں سے اُلٹے پاؤں لوٹ پڑو، ورنہ یاد رکھو مارے گئے۔ شکاری کتے کے دانتوں کی طرح عورت کے دانت بند ہو کر پھر کھلتے نہیں ہیں۔ ساری شیخی کرکری ہو جائے گی۔ تمہارا دل اگر اس عورت کے متعلق واقعی بے چین ہونے لگا ہے تو کہیں نہ کہیں نکاح کر لو۔ صرف یہی صورت بچاؤ کی ہے۔ تمہارے خاندان ہی میں حسین اور دولتمند لڑکیاں موجود ہیں۔ عیاشی تو تم خوب کر چکے۔ مگر یہ پھندا بُرا ہے سنتے ہو؟ یہ عورت کہیں تم کو گدھا بنا کر نہ چھوڑ دے ـــــ اور خدا جانے وہ کیا کیا بکے گا۔ میں نے سنا ہو تو لکھوں؟ گویا یہ سب سامانِ عاشقی فراہم ہو رہا ہے ـــــ ہمارے لئے ـــــ ایک ناصحِ مشفق بھی پیدا ہو گئے۔ ان کی بھی ضرورت تھی!!

---

۱۱ مئی ۱۹۲۹ء

اعلانِ اُلفت بغیر ارادہ کے ـــــ آنسو نکلے کہ ہچکیاں عرضِ حالِ دل! بیتابیٔ تمنا ـــــ غرض کہ کل رات بیٹھے بیٹھے بکھر گیا۔ یہ سب کیونکر ہوا کیسے ہوا ـــــ مجھے تو خبر نہیں ـــــ مگر تھی بہت طفلانہ حرکت اپنے اوپر لعنت بھیج رہا ہوں وہ ہنستی رہی میں روتا رہا ـــــ توبہ توبہ ـــــ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ اُس نے میری بے تابیوں کو بہت ہی تحقیر کی نظروں سے دیکھا چلتے وقت تو صاف کہہ گئی ـــــ مجھے اس کا ہر لفظ یاد ہے، "آپ اس وقت اتنے انسان نہیں جتنے لگتے ہیں۔ عورت بازی کرتے کرتے عشق بازی کرنے چلے۔ میں تو اب آپ کے ساتھ رات بھر اس سینہ کوبی میں شریک ہونے کیلئے آنے سے رہی!

۱۹ مئی سنہ ۱۹۲۹ء

بلاتا ہوں تو نہیں آتیں - ہار کر کل خود گیا - دروازہ بند کرا لیا۔
میر صاحب کو بھیجا تو ان سے کہہ دیا کہ "جب تمہارا دماغ صحیح ہوگا تب آؤنگی ابھی تو چالیس دن تک سر پر برف کی تھیلیاں رکھے بیٹھے رہو!"
ابھی اختر آئے تھے - مواعظ حسنہ کا ایک پشتارہ لیکر آئے تھے خدا جانے کیا کیا بکتے رہے - کہنے لگے تم مرد ہو، تمہیں اپنی صنف کی تحقیر کو کسی عورت کے مقابلہ میں اس قدر پست نہ کرنا چاہئے اور عورت بھی ایسی ذلیل ـــــ ایک ٹکے کی عورت ـــــ سنتا رہا، سنتا رہا وہ بکتے رہے - بکتے رہے - آخر میں نے کہا کب تلک کوئی نہ بگڑے، حال بگڑا جاتا ہے اپند و نصائح کے ذخائر تم سے زیادہ میرے پاس ہیں ـــــ میاں اختر ـــــ میں ایک بازاری عورت کے مقابلہ میں مفتوح اور بے بس ہو جانے کی ذلت کا بھی اندازہ کرسکتا ہوں! ـــــ
جب وہ استہزا کرتی ہے اور مجھے ٹھکراتی ہے تو میرے قلب کے اندر وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ گویا میں اپنی جان دیدونگا اور اسکی جان لے لونگا ـــ پھر جب اپنے خشک ہونٹوں کو تر کر کے، اپنی مٹھیاں باندھ کر - سینہ نکال کر سنبھلتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ میری صنف کی جو توہین کر رہی ہے - اُس کا جواب دوں - تو دفعتہً گویا ایک قسم کا فالج ـــــ روحانی اور اخلاقی ـــــ مجھ پر گرتا ہے گونگا ہو جاتا ہوں ـــــ وہ کہتی ہے ـــ سنتے ہو اختر؟ ـــــ کہتی ہے تم میں جو سب سے زیادہ مردمی اور مردانگی کا مدعی ہوتا ہے - وہی سب سے بڑا نامرد اور

بزدل ثابت ہوتا ہے ـــــ کیا میں ان تیروں کی نوک کو اپنے قلب میں کھٹکتے محسوس نہیں کرتا ـــــ قسمیں کھاتا ہوں کہ آج کے بعد "لیلیٰ" کی صورت نہ دیکھوں گا اور پھر صبح کو اسی کے ہاتھ جوڑتا ہوں کہ کل ضرور آنا ۔ کچھ سمجھ سکتے ہو تم میری اس حالت کو؟ ـــــ میری عقل گم ہے ـــــ یہ کیا ہو گیا ـــــ اختر تمہیں بھی نہیں معلوم اور مجھے ـــــ

۲۵ر مئی سنہ ۱۹۲۹ء

خطرہ سامنے آنے میں ہے۔ نظر ملانے میں ہے میری آنکھیں سب سے زیادہ کمزور ہیں۔ وہ اس کو راستہ دیتی ہیں! اب وہ خفا ہے۔ میں بھی خاموش ہوں۔ شاید کچھ دن اس طرح گذر جائیں تو پھر میں اپنا توازن قائم کر لوں ـــــ آجکل شراب بہت پیتا ہوں۔ اپنی محفل میں بہت سی عورتیں جمع رکھتا ہوں دن بھر قہقہے مارتا ہوں خوب پیتا ہوں۔ پیتے پیتے رات کو کسی وقت غافل ہو جاتا ہوں صبح کو اٹھ کر پہلے صبوحی۔ پھر ناشتہ۔ اڑا ہوا رنگ پھر جم جاتا ہے۔ بجلیاں پھر کوندنے لگتی ہیں ـــــ اس طرح تم بھلا جا رہی ہو۔ خبر ہے تم کو؟ ـــــ کوئی میری محفل میں لیلےٰ کا نام نہیں لیتا۔ میں بھی نہیں لیتا ـــــ زبانیں قابو میں، دل میں پھر بھی وہ نام کھٹکتا ہے۔ جب کچھ کھٹک بڑھتی ہے ایک جام لبریز پی لیتا ہوں ـــــ یہ جواب ہے تیری زہد دشمنیوں کا ـــــ ادلبائے بے درماں ـــــ

---

۲۶ مئی ۱۹۲۹ء

ہرن کو پکڑ کر لائے تھے، اصطبل میں باندھنے کیلئے ——
وہ نہ بندھا۔ ایک ہی جست میں رسیاں تڑا کر کہاں سے کہاں پہنچا! تیتری ——
کو لائے تھے۔ قفس میں بند کرنے —— وہ اپنے رنگین پر پھیلا کر صاف نکل گئی!!
بچہ ہٹ کر رہا تھا کہ وہ آسمان کے ماہتاب کو پکڑ کر اپنی گود میں رکھ دے اس کے ——
ہاتھ پھیل کر رہ گئے —— وہاں تک نہ پہنچ سکے —— زندگی کے نظم کو نہ توڑو۔ ہرن کو
جنگل میں رہنے دو —— وہی اس کا وطن ہے —— تیتری کو شاخِ گل پر جھولنے دو
وہی اس کا مسکن ہے —— چاند وہیں رہیگا جہاں ہے —— بچے سے کہو اس ——
کو دیکھ کر تالیاں بجائے اور ناچے مگر اس کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے —— وہ بلند
ہے اور بعید ہے! —— میں اپنے دل کو تسکین دے لیتا ہوں۔ وہ عورت میرے
لئے موزوں نہیں اسکے حُسن کی سنجیدگی میرے رندانہ عشق کی حریف نہیں ہو سکتی۔
جنس مختلف ہے۔ مذاق جداگانہ ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو تول لیا۔ وزن ایک
نہیں!! پھر یہ ساری دردسری کیوں؟ —— دل بہکاتا ہے عقل سمجھاتی ہے ——
میں شراب کی بوتل پر ہاتھ دھر کر قسمیں کھاتا ہوں۔ توبہ کرتا ہوں ——
شراب، جوانی، عیش اور حُسن کے ہنگاموں میں جب کبھی تھوڑا وقفہ ہوتا ہے
اور تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ تو پھر وہ یاد آجاتی ہے۔ عقل کہتی ہے یہ تکلیف بھی چند
روزہ ہے گھبراؤ نہیں۔ تو بھول جائیگا ——

۲۸ مئی ۱۹۲۹ء

عقل - گذشتہ غلطیوں کی ہوئی واپس آرہی ہے ــــ کا نام تجربہ ہے۔ حماقتوں کے بھنور میں پھنس تو گیا تھا مگر بچ گیا۔ میرا فلسفہ آڑے آیا۔ دوست احباب تو سر پیٹتے ہی رہے تھے۔ کہ ہائے گیا ہاتھ سے مگر گناہ کی قوت ابھی مجھ میں باقی ہے "بی لیلیٰ" روٹھ کر بیٹھ رہیں اور مجھے گرداب الفت سے نکلنے کا راستہ مل گیا۔ تم روٹھے ہم چھوٹے ــــ اپنی عیاشی اور حسن پرستی کی زندگی میں چند فلسفیانہ اور حکیمانہ اصول میرے رہنما رہے ہیں۔ ان کو اس روزنامچہ میں قلم بند کئے دیتا ہوں۔ تاکہ میرے آئندہ پیدا ہونے والے فرزند کے اس وقت کام آئیں جب وہ جوان ہو کر عالم نسواں میں اپنے مجاہد باپ کی طرح فتوحات شروع کرے!

(۱) اپنے تمام افعال پر انسان کو ناز کرنا چاہیئے اور ان افعال میں جس قدر گناہ (بہ اصلاح عام) کی آمیزش ہو اسی قدر ان کو زیادہ مایہ ناز سمجھے!

(۲) گناہ کی کھیتی دماغ ہے ــــ نہ دل نہ ضمیر۔ اسی کو اپنے نفس کا رہنما بناؤ۔

(۳) معصوم اور گنہگار میں فرق صرف اتنا ہے کہ معصوم ایک بوسیدہ اور مردہ ماضی رکھتا ہے اور اسی کے دامن سے لپٹا پڑا رہتا ہے اور گنہگار ایک وسیع مستقبل دکھتا ہے اور اسی کی طرف بڑھا چلا جاتا ہے!

(۴) عیاشی کی روح بوڑھی پیدا ہوتی ہے مگر عمر کے ساتھ ساتھ جوان ہوتی

جاتی ہے جسقدر گناہ کرو اسی قدر روح جوان ہوتی جائے گی۔ البتہ جسم نوعمر اور جوان پیدا ہوتا ہے اور جسقدر زمانہ گزرتا ہے بوڑھا اور کمزور ہوتا جاتا ہے۔

(۵) "اخلاق" ایک بے معنی اصطلاح ہے۔ عیش جس کے اندر جلبیت کی لرزش حیات موجود ہو اصل حیات ہے۔

(۶) مرد کی زندگی میں عورت محض ایک ہندسہ ہے جسکی قیمت کے گھٹنے بڑھنے کا انحصار اس کا محل وقوع ہے۔

(۷) وسوسہ اور ترغیب کا علاج امتناع نہیں ہے، ارتکاب ہے۔

میری زندگی کے لیے کتنے ہی روشن اصول میرا راستہ صاف رکھتے ہیں میری اولاد کا راستہ بھی صاف رکھیں گے۔ اور جو کوئی اس روزنامچہ کو پڑھیگا اس کا بھی۔ اختر سے آج میں نے کہہ دیا کہ عشق کا تپ لرزہ دو چار حملوں کے بعد ختم ہوگیا ہے میں اب پھر ایک ہوش مند انسان ہوں اور حسن کا بے پروا ڈاکو! اختر خوش ہوگیا۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا کہنے لگا۔ خوب بچے یلہ۔ بال بال بچے، لو آؤ ایک جام! بیاد رفتہ لیلیٰ!

---

۳ جون ۱۹۲۹ء

اتنی خفا ہوئیں کہ اس شہر سے بھی چلی گئیں۔ میر صاحب خبر لائے تھے میں نے کہا میر صاحب جانے والوں کی خبر لاتے ہو۔ آنے والوں کی خبر لاؤ۔ کوئی نیا مال آیا ہو، کوئی نئی دکان کھلی ہو تو پتہ بتاؤ، رہی لیلیٰ کی قسم کی عورتیں! تو انہیں تو یا عجائب خانہ میں رکھو کہ اہل نظر مطالعہ کیا کریں، یا جہاز کا ٹکٹ دلوا

کرنج کے لیئے روانہ کردو! عمل کی دُنیا میں اس قسم کی عورتوں کا وجود اہل کمال کو سرگرداں کرتا ہے!

۶؍جون ۱۹۲۹ء

زندگی نام ہے حرارت اور حرکت کا، سوال یہ ہے کہ اس حرارت اور حرکت کی استعداد کو تھوڑا تھوڑا خرچ کر کے زندگی کی مدت بڑھائی جائے یا جلد اور زیادہ مقدار میں خرچ کر کے آمد اور خرچ کی میزان کو بعجلت برابر کر دیا جائے! چراغ کی بتی بھی اور تیلی رکھی جائے تاکہ روشنی دیر تک (گو کہ کم) باقی رہے یا موٹی سی بتی ڈال کر اور جلدی جلدی سے اس کو بڑھا کر تیز روشنی کی جائے اور جو تیل دس راتوں کو کام دیتا ہو۔ اس کو ایک ہی شب میں خرچ کر ڈالا جائے؟ روشنی کی تیزی زیادہ اچھی یا چراغ جلنے کی مدت کا طویل ہونا بہتر؟ جن کو اللہ میاں کہا جاتا ہے۔ انہوں نے تو انسان کو عجب مخمصہ میں پھنسا دیا ہے۔ یعنی یا تو ہلکی اور مدھم روشنی میں گھر کے نیم تاریک کونوں میں پڑے ٹٹولتے رہو۔ اور اس طرح زیادہ عرصہ تک اندھیرے میں اپنا سانس جاری رکھو یا ایک ہی شب میں چراغ کو تیز جلا کر سارا گھر بقعۂ نور بنا دو اور باقی راتیں بالکل اندھیری رکھو۔ چراغ کے تیل کی مقدار مقررہ ہے ازل کے کسی مشعل فروز نے ہر چراغ کو اس کے حصہ کا تیل ناپ تول کر دے دیا ہے اس مقدار میں بیشی خارج از بحث ہے۔ خرچ کا اوسط البتہ اگر تم چاہو تو کم و بیش ہو سکتا ہے! اب بتلایئے درآمد پر قابو نہیں، برآمد ایک حد تک اختیاری ہے پھر کیا کیا جائے؟

جوانی میں زندگی کی ساری پونجی پھونک ڈالیے یا بڑھاپے کی انتہائی حد تک زندہ رہنے کے لیے اس پونجی کو حد درجہ کفایت شعاری اور جزرسی کے ساتھ خرچ کیجیے ـــــ ایک شب چراغ کی پوری روشنی سے شب کو دن کر لیجیے یا اس چراغ کو ستراسی برس کی عمر تک ٹمٹمانے دیجیے۔ آندھیوں سے بچا لیجیے، ہوا کے تیز جھونکوں سے محفوظ رکھیے ـــــ دامن کی آڑ میں کسی کونے کی طاق میں، کسی فانوس کے اندر ـــــ ہر روز تیل اور بتی کا معاینہ کرتے رہیے۔ اب بتی اتنی باقی ہے۔ تیل اتنا ہے۔ ہوا تیز ہے۔ کہیں آندھی نہ آ جائے۔ تیل نہ گر جائے۔ بتی خشک نہ ہو جائے ـــــ ان تردّدات میں بد حواس رہیے مگر زندہ رہیے ـــــ سانس آپ کا چلتا رہے۔ یہ نہ کتنے پائے !!

مکان جب بوسیدہ ہو جائے۔ اس کی دیواریں جھک جائیں اس کی محرابوں میں شگاف پیدا ہونے لگیں تو کیا یہ بہتر نہیں کہ اس کو گرا دیا جائے؟ یہ بہتر ہے۔ کہ اسی کھنڈر میں پڑے رہیے۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہیے کہ آج یہ دیوار گری کل وہ چھت بیٹھ گئی۔ یہ ستون ٹیڑھا ہو گیا ـــــ وہ بنیاد غرق ہونے لگی ـــــ روز اس عمارت کی تباہی کو پڑے دیکھتے رہیے مگر ارادہ یہ رکھیے۔ کہ جب تک دو اینٹیں بھی باقی ہیں۔ ہم تو اسی گھروندے میں لیٹے رہیں گے۔ تا آنکہ اس کی آخری دیوار کے نیچے دب کر رہ جائیں ـــــ

اس نقطہ پر پہنچ کر جہاں سے جوانی کا انحطاط شروع اور بڑھاپے کا آغاز ہوتا ہے اس قسم کے سوالات ہم جیسے اہل بصیرت کے دلوں میں پیدا ہوا کرتے ہیں ـــــ ان سوالوں کے جوابات تعداد میں اتنے ہی ہیں جتنے دنیا میں انسان۔ ہر شخص اپنے دماغ

میں ایک جواب رکھتا ہے۔ لیکن میں تو کہتا ہوں، زندگی سے موت کا خطرہ نکال دیجئے! یہ تو اپنے اختیار میں نہیں کہ فنا کی شرط کو اپنی زندگی سے خارج کر دیں۔ ہوتا تو یہی کرتے —— لیکن موت کے خطرہ کی تلخی کو زندگی کی حلاوت سے جدا کرنے کی ترکیب یہ ہے تو کچھ مشکل نہیں کہ موت کے قریب پہنچنے سے پہلے تم خود اسکے قریب پہنچ جاؤ، بجائے اسکے کہ وہ آئے اور اسکے آنے کے خطرے کے خیال میں تم اپنی جان گھلاؤ، تم ہی اس کے پاس چلے جاؤ! —— بے تکلف ہنستے کھیلتے! اس طرح زندگی کے نصف اجزاء کو تم موت کے خیال کی تلخیوں سے بچا لوگے۔ پہلے اس سے کہ ڈاکوؤں کی جماعت تمہارے گھر پر دھاوا کرے تم اپنی ساری دولت لٹا دو اور جب کچھ نہ رہے تو گھر کا دروازہ کھول کر پکارو۔ آ۔ لوٹنے والے! آ جا! لوٹ! کیا لوٹتا ہے، چھین کیا چھینتا ہے؟

یہ فلسفہ ایسی جوانی کا ہے جو بڑھاپے کی چٹان سے بندھا ہونا پسند نہیں کرتی، جو اپنے گلے میں بڑھاپے اور موت کے امکانات کا بھاری پتھر لٹکانا نہیں چاہتے —— زندہ رہو جب تک جوان رہو اور جب بڑھاپا اپنے آنے کی اطلاع بھیجے تو دفعتاً مر جاؤ، فنا ہو جاؤ! یہ فلسفہ لوگوں کی سمجھ میں تو آتا ہے۔ مگر وہ اس کو مانتے نہیں یہ سب بدبخت اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ بڑھاپے میں بھی کچھ نہ کچھ جوان رہنے کی کامیاب کوشش کر سکتے ہیں، پرانی تیلیوں پر ہر چھٹے مہینے نیا غلاف چڑھا کر گویا تیلیوں کو بھی نیا کر لیا جا سکتا ہے۔ سونا کھائیں گے —— جواہرات گھول کر پی جائینگے۔ جسم کی رگوں میں سوئیاں بھونک کر محرک دوائیں پہنچائینگے تاکہ ان کے آغوش میں عورت ان کی گرفت کو کمزور محسوس نہ کرے، پھپلے منہ میں نئے

دانت لگائیں گے۔ تاکہ ان کے بوسوں کا چٹخارا جوانی کے بوسوں سے ملتا جلتا ہے
سفید بالوں پر خضاب کی استرکاری کریں گے تاکہ ۶۰ برس کی عمر میں عورت ان کو
بہم سے زیادہ کا نہ سمجھے۔ عمر دریافت کیجئے تو ہمیشہ پچاس کی بجائے، ۳۰ بتائینگے
اور ۳۰ بتلاتے ہوئے بھی، شرمائیں گے دل میں شکوہ کرینگے کہ کیوں ان کی اجازت
کے بغیر عمر بڑھ جاتی ہے۔ جس قدر عورت اپنی عمر کو ظاہر کرتے گھبراتی ہے، اسی قدر
وہ بڈھا مرد بھی جو جوان بننے کی کوششوں میں مصروف رہتا ہو عمر کے متعلق کسی
سوال کا جواب دیتے ہوئے گھبراتا ہے —— یہ گھبراہٹ قبول، یہ شرمندگی
قبول میر ضعف قبول، بڑھاپا قبول، مگر زندگی عزیز —— مرتے ہیں کہ کسی
طرح موت کے آنے کو ملتوی کیا جا سکے —— ! وہ آئے گی ضرور، زندگی کے
حقائق میں صرف وہی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے —— سامنے سے
میاں اختر چلے آ رہے ہیں۔ چہرہ پر رونق ہے۔ لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ۔ رات
اس بدمعاش نے ضرور کوئی نیا شکار مارا!

۱۱ر جون ۱۹۲۹ء

کہتے ہیں کہ کل رات دو بجے زلزلہ آیا تھا۔ کئی جھٹکے محسوس کئے
گئے، شہر میں کچھ پرانے مکانات گر گئے۔ کچھ نئی دیواروں میں شگاف پیدا ہو
گئے۔ دس بیس گھروں میں محرابیں شق ہو گئیں، ستون ٹیڑھے ہو گئے —— آج
کے اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مقامات پر چار پانچ ہزار آدمی ہلاک ہو
گئے۔ ایک دو شہر ہی تباہ ہو گئے —— بس اتنی سی بات کا ایک ہنگامہ

برپا ہے گویا کہ زلزلہ ایک بالکل نئی قسم کا واقعہ ہے جو انسان کی زندگی میں پہلے کبھی پیش نہ آیا تھا۔ ایک ایسا حادثہ ہے کہ اس جیسا پہلے نہ سنا گیا نہ دیکھا گیا گویا کہ کل سے پہلے نہ کبھی کوئی دیوار گری تھی، نہ کوئی محراب شق ہوئی تھی۔ نہ کوئی مرا تھا! اور گویا چار پانچ ہزار آدمیوں کا مرجانا تو بالکل ہی عجیب واردات ہے جو آج تک کسی انسان کے خیال و گمان میں بھی نہ آئی تھی!!

صبح ہی صبح میر صاحب دوڑے ہوئے آئے۔ ارے جناب! کل زلزلہ آیا کیا قیامت کا زلزلہ تھا، اللّٰہم احفظنا، کوئی جھٹکا آپ نے بھی محسوس کیا؟ میں میر صاحب کی بدحواسی دیکھ کر ہنس پڑا۔ زلزلہ؟ زلزلے تو ہماری زندگی میں روز آتے رہتے ہیں، نئی بات کیا تھی میر صاحب؟ میر صاحب کی اور میری گفتگو بہت دلچسپ تھی جو کچھ یاد ہے لکھتا ہوں۔

میر صاحب۔ کیوں حضرت آپ نے بھی کوئی جھٹکا محسوس کیا؟

میں۔ جی ہاں! میں ٹھیک ۲ بجکر ۵ منٹ پر بوتل سے گلاس میں لوٹ رہا تھا۔ جھٹکہ جو آیا چھلک گئی! اور وہ اس وقت میرے پاس تھیں وہ گھبرا کر میرے سینہ سے چپٹ گئیں، اور میں نے جو چھت کو ہلتے دیکھا تو میں سمجھا کہ آج آب گلرنگ ذرا تیز ہے اور میں نے میر صاحب جلدی سے ایک گلاس خالی کرکے دوسرا بھر لیا، میں نے کہا اگر چھت سر پر گر پڑی تو میں ایک آخری جرعہ سے کیوں محروم رہ جاؤں، کیوں میر صاحب! یہ نہ کرتا تو کیا کرتا؟

میر صاحب۔ حضرت! مذاق تو چھوڑیئے! یہ کیا موقع ہے؟

میں۔ مذاق؟ مذاق کیسا میر صاحب؟ میری آپ کی گفتگو ہمیشہ سنجیدہ ہوئی

ہے۔ زلزلہ آیا، اس میں تو کلام نہیں، یہ اندیشہ بھی بجا تھا کہ مکان گر پڑتا۔ اور میں دب کر مر جاتا، بلکہ میرے ساتھ وہ بھی مر جاتیں جو اس وقت آرائش خلوت تھیں۔ اِن امکانات میں مذاق کی گنجائش کہاں؟ مگر ایسا ہو جاتا تو آئندہ کے بہت سے امکانات سے ہوتا، رات میں بچ گیا، اور اگر اسی طرح آئندہ زلزلوں سے بھی بچتا رہا تو بڑھاپا شروع ہو جائے گا، صحت خراب ہونے لگے گی زیادہ پیوں گا تو سر میں درد ہوا کرے گا۔ پھر گردوں میں درد ہوا کرے گا پھیپھڑے خراب ہو جائیں گے جگر ماؤف ہو جائے گا۔ دس پانچ مہینے پلنگ پلنگ پر لیٹا رہوں گا۔ اطبا اور ڈاکٹروں کا تختۂ مشق بنوں گا۔ آپ جیسے دوستوں کو تیمارداری کی تکلیفیں برداشت کرنی ہوں گی ———— ان مصیبتوں سے مشکل سے مروں گا ———— دس برس بعد جو کچھ ہوتا ہے وہ رات ہی ہو جاتا ———— ایک ہاتھ میں جام شراب ایک ہاتھ یار کی گردن میں، اوپر سے گرتی چھت ———— صبح کو آپ سب احباب آکر پتھر اینٹوں اور کڑیوں کے ڈھیر کے نیچے سے میرے کچلے ہوئے جسم کو نکالتے!

میر صاحب۔ توبہ توبہ! حضرت! آپ تو موت سے مذاق کرتے ہیں۔

میں۔ مذاق وذاق نہیں میر صاحب! بات یہ ہے کہ جب مسافر کو اپنی منزل پر جانا ضرور ہو تو قریب کا راستہ کیوں نہ اختیار کرے۔ دِلّی سے کلکتہ جانا ہو۔ تو کشمیر ہو کر کیوں جائے! ابھی آپ کچھ ہی کہیں، میں تو یہی کہتا ہوں کہ رات بڑا اچھا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

میر صاحب۔ لاحول ولاقوۃ، آپ بھی کیا باتیں کر رہے ہیں۔ ذرا غور تو

کیجیے۔ ملک کے ایک حصہ میں قیامت صغرا بپا ہے۔ ہزاروں بچے یتیم ہو گئے۔ ہزاروں عورتیں بیوہ ہو گئیں ——— ہزاروں انسان بے خانماں ہو گئے! ———

اجی میر صاحب! ذرا تو ٹھہریئے، آپ تو منہ اٹھائے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ ذرا لگام کھینچے ہوئے، سوچتے نہیں کیسے چلے جاتے ہیں، آپ تو ایسی باتیں کر رہے ہیں گویا دنیا میں جو کچھ ہونا تھا کبھی نہ ہوا تھا۔ وہ سب ہو گیا۔ اے حضرت! بچے تو کبھی یتیم ہوا کرتے ہیں۔ میں اور آپ خود یتیم تو یہاں ہی بیٹھے ہیں۔ عورتیں بھی سب کبھی نہ کبھی بیوہ ضرور ہوتی ہیں، مکانات ویسے بھی مسمار ہوا کرتے ہیں ——— پھر نئی بات آپ کو کیا معلوم ہوتی رہا یہ امر کہ ہزاروں آدمی بے خانماں ہو گئے لہٰذا ہمدردی کے مستحق ہیں تو جناب، اس دنیا میں کروڑوں انسان ہر لمحہ مبتلائے عذاب رہتے ہیں۔ ان کروڑوں میں اگر دس پانچ ہزار کا اضافہ ہو گیا تو آپ کی روح کیوں تحلیل ہونے لگی؟ یہ تو ماں باپ کی غلطی ہے کہ بچے یتیم ہو گئے انھوں نے پیدا ہی کیوں کئے ——— جو عورتیں بیوہ ہونے سے گھبرائیں وہ شادی ہی کیوں کریں، اور جو لوگ بے خانماں ہونے سے ڈریں، وہ مکانات ہی کیوں بنائیں۔ جائدادیں کیوں خریدیں، بستیاں اور شہر کیوں آباد کریں ——— میر صاحب بیچارے کچھ نہ سمجھے! کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، کچھ بسورنے لگے جب میر صاحب سے جواب بن نہیں پڑتا تو بسورنے لگا کرتے ہیں! میں نے کہا میر صاحب! یہ جو ہمدردی کا جذبہ انسان سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی حقیقت بھی کچھ آپ کو معلوم ہے

یہ جذبہ درحقیقت خوشی اور اطمینان کا جذبہ ہے، اِس کا تجزیہ کیجیے تو اِس کے اندر بڑا عنصر خوشی اور اطمینان معلوم ہوگا (میر صاحب نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں خوب سکیڑ کر مجھے گھورنا شروع کیا) جب کوئی شخص مصیبت زدہ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ تو وہ گویا اپنے اطمینان و آسائش کے کے مقابلہ میں اِس شخص کی مصیبت کو دیکھتا ہے اور اِس امر سے مطمئن ہوکر میں خود بعافیت ہوں کہتا ہوں "افسوس زید کس قدر بیمار ہے" وہ ڈرتا ہے کہ وہ خود اِس قدر بیمار نہ ہو جائے اور خوش ہے کہ اِس کی یہ حالت نہیں، کچھ نہیں میر صاحب یہ ساری ہمدردی کچھ خوف ہے اور کچھ خود غرضی! کسی کو مرتے دیکھتے ہو تو کہتے ہو تو زبان ہو کہ افسوس مرگیا بے چارہ، اور دل میں کہتے ہو کہ کہیں ہم نہ مرجائیں شکر ہے کہ زندہ ہیں یعنی فی الحال یہی غنیمت ہے کہ اسی کو موت آئی ہم زندہ رہے، غنیمت ہے! یا جب کسی کو فکر و فاقہ میں مبتلا دیکھتے ہو تو کس قدر ہمدردانہ لہجہ میں کہتے ہو۔ ہائے بیچارے پر کیسی مصیبت پڑی ہے مگر اُس وقت تم اپنے بینک کے پاس بک کی آخری میزان کا تصور کرتے ہوتے ہو اور تمہارا دل چپکے چپکے کہتا ہوتا ہے۔ شکر ہے، میرے پاس تو دولت کافی ہے۔ خدا نہ کرے میں فاقے کروں! تو میر صاحب قبلہ! ہمدردی و ہمدردی کو رکھیے بالائے طاق جن کو مرنا تھا مر گئے جن کو یتیم ہونا تھا ہوگئے۔ ہمارا آپ کا وقت آئے گا۔ تو ہم بھی لٹھا کا آدھا تھان لپیٹ کر قبر میں جائیں گے اور ممکن ہے کہ کفن بھی نصیب نہ ہو آخر وہ ایسی بات کیا ہے۔ جس کے لئے آپ اخبار کا پلندہ بغل

میں ڈھلے ہوئے، صبح ہی صبح میرے غریب خانے پر نازل ہو گئے۔ اے جناب! زلزلے تو صبح سے شام تک آتے رہتے ہیں، یہ کیا ضرور ہے کہ جب زمین ہلے جب ہی آپ کہیں کہ زلزلہ آیا۔ جب میں کسی حسین عورت کو دیکھتا ہوں تو زلزلہ آتا ہے جب آپ کی سیدانی آپ کو ڈانٹتی ہیں تو زلزلہ آتا ہے۔ جب میرے گھر کسی شب کو شراب کا گودام خالی ہو جاتا ہے تو زلزلہ آتا ہے۔ آپ کا بڑھاپا زلزلوں سے خالی نہیں۔ اور میری ساری جوانی زلزلوں سے معمور ہے۔ پھر اس اختلاجِ قلب کے کیا معنی؟ ——— بسورتے کیوں پھر رہے؟ افسوس کہ میر صاحب تم پیتے نہیں، ورنہ ایک جام لبریز پیش کرتا اور کہتا ہاں۔

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو

——— میں چھوٹی میز پر سے سگریٹ کا بکس اٹھانے مڑا اور پھر جو لوٹا تو دیکھا میر صاحب مع جوتیوں کے غائب ——— سیدھے محلہ کی مسجد میں گئے ہوں گے، نفل پڑھے ہوں گے، توبہ کی ہوگی، میرے لئے ہدایت اور نجات کی دعائیں مانگی، اور زلزلہ کا خیال ہوگا تو ردّ بلا کا وظیفہ پڑھنے بیٹھ گئے ہوں گے ——— واہ میر صاحب واہ ———

۱۴ر جولائی ۱۹۲۹ء

ایک مہینہ بمبئی کی سیر و تفریح میں گذرا۔ چند پرزوں پر وہاں کے کچھ مشاہدات لکھ لیے تھے۔ خدا جانے وہ پرچے کہاں پھینک دیئے

تھکا تھکایا گھر آیا ہوں، سوچتا جاتا ہوں اور لکھتا جاتا ہوں۔ بہت سی باتیں یاد نہ
رہیں۔ خیر جو یاد ہیں اُن کو تو لکھ لوں۔ ہر وہ بات جس کا تعلق عورت سے ہو مجھے
عموماً یاد رہتی ہے، سوائے اِس عورت کے، کہ عورتیں ہوں تعداد میں زیادہ اور ایک
کی یاد دوسری کی یاد پر چڑھتی چلی جائے ـــــ بمبئی کی سیر زیادہ تر طالبعلمانہ تھی۔
یعنی "فن کے متعلق" معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ حسن فروشی کی ادنٰے دکانوں
پر اور عامیانہ بازاروں میں، ان گلی کوچوں میں جہاں "شرفا" دن کے وقت نہیں
جانے مگر رات کو جانے میں کچھ حرج بھی نہیں سمجھتے، ہر جگہ عورت کی فطرت کا "مطالعہ"
پُرلطف بھی ہو سکتا ہے اور عبرت انگیز بھی۔ مجھے لطف سے کام ہے۔ عبرت
کی آنکھ بند رکھتا ہوں۔ پھر بھی بمبئی کے اس بے تکلف اور بے حجاب طبقہ
کی زندگی کا فلسفہ میرے لئے دلچسپ تھا۔ اِس لئے کہ نیا تھا۔ پہلی دفعہ یہ تماشا میں
نے دیکھا کہ سر بازار بلایا اور پکارا گیا ہوں، اور ہندوستان کی عورت مرد کے آگے
بڑھنے کا انتظار کرتی ہے، مگر بمبئی کی یہ بین الاقوامی آبادی خود مردانہ وار آگے بڑھ کر
مرد کو ٹوکتی ہے۔ کدھر چلے! ادھر آؤ۔ آپ ان کے دروازوں کے قریب سے گذر یئے
وہ عجیب عجیب آوازوں سے مختلف اور نئی نئی زبانوں میں آپ کو مخاطب کرتی ہیں۔
جس وقت آپ ان کے "عیش کدہ" میں داخل ہوں "مائی ڈیر اور ڈارلنگ" کی بھرمار
رہتی ہے۔ جب آپ کے دونوں پاؤں چوکھٹ کے اس طرف پہنچ گئے تو پھر پہلا سوال ہوتا
ہے "ہاؤ مچ؟" فضولیات اور تمہیدات کی وہاں اجازت ہی نہیں، وقت بہت قیمتی ہے
حاشیہ کی عبارت بالکل نہیں، جو کچھ ہے متن ہی متن ہے! گاہک آئے سودا خریدے
اور جائے! بافضولی چہ کار ــــــ ایک دن اتفاقاً ایک ذرا پڑھی لکھی چھوکری

مل گئی۔ جب انہوں نے بھی خالص کاروباری انداز اختیار کیا تو میں نے ان سے
کہا۔ مس صاحبہ! مجھے تو آپ کی اس تاجرانہ ذہنیت سے گھن سی آتی ہے۔
عورت و مرد کی یکجائی کا لطف مزے مزے کی باتوں اور دلچسپ گفت و شنید
میں ہے جسم کی کشش تو تعیش کا محض ایک جزو ہے، یہ نہیں کہ نانبائی کی دکان
پر دو خمیری روٹیاں جس طرح بنا حلق سے اُتاریں، دو گھونٹ پانی پیا۔ اور دانت
کریدتے ہوئے چل دیئے تعیش کی لازمی شرط اطمینان اور فرصت ہے، عیش
پسند کھانا بھی کھاتے ہیں تو وہ گھنٹے آہستہ آہستہ منہ چلانے میں صرف کرتے ہیں تاکہ
ہر لقمے کے پورے مزے سے ان کی زبان لطف اندوز ہو جائے اور ہر کھانے
کے آب و نمک سے ان کے نفس کو زیادہ سے زیادہ ممکن وقت تک مسرور ہونے کا
موقع ملے۔ عورت کی مجلس آرائی کا منشا بھی ہم لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ نفس کا "کیف"
شراب کے نشہ کی طرح دیر تک قائم رہے۔ یہ سب سن کر کہنے لگی کس ملک کے جانور
ہو؟ لطف صحبت میں وقت ضائع کریں تو پھر فاقے کیا کریں؟ تم جیسے آنے والے
کوئی جاگیر یا جائداد تو ہمارے نام لکھ نہیں جاتے ―― میں نے کہا خفا کیوں
ہوتی ہو مس صاحب انسانوں کی طرح غصّہ نہ کرو، تم انسان ہی کب ہو تجارتی
مشینیں ہو، مشین کو غصہ نہیں آیا کرتا! ہاں! ہم انسان نہیں" اس نے کہا ہاں!
ہم انسان نہیں، مگر کس نے ہمیں حیوان بنایا؟ دوکاندار وہی مال تو دکان پر رکھتا
ہے۔ جسکے گاہک آتے ہوں، یہ نہ کرے تو دکان کیونکر چلے! تم حیوانوں کا جو کچھ مذاق
ہے اسی کے مطابق ہم اپنی دکان سجاتے ہیں۔ ایکدن میرے گھر بیٹھکر تماشہ دیکھو
کیسے کیسے سیٹھ یہاں آتے ہیں، میں کبھی بھول کر وہ باتیں شروع کر دیتی ہوں، تو

بغلیں جھانکنے لگتے ہیں، گھبرا کر بھاگتے ہیں، تم "مجلس آرائی" کی توقع کرتے ہو۔ اور حال یہ ہے کہ میرے خریدار اس طرح میرے پاس آتے ہیں کہ گویا سگریٹ کی ایک ڈبیا خریدنے آئے تھے!"

ایک دن ایک مغربی "خاتون" سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگی۔ ہمارے ملک میں جس شغل کو تم محبت اور عاشقی کہتے ہو وہ بھی تجارتی زندگی کے سانچہ میں فٹ ہو گیا ہے۔ بڑے بڑے سودے کم سے کم وقت میں طے ہوتے ہیں——

اصل سوال وقت کا ہے نہ مرد کے کام کا ہے نہ عورت کا! اور ہو بھی کیا؟ ہر شخص مصروف اور عدیم الفرصت ہے! ایسی زندگی کے نظام اوقات میں ہر شغل کیلئے پیمانۂ وقت مقرر ہے، یہ نہ ہو تو مرد بھی فاقے کریں اور عورتیں بھی۔

ایک اور پلیس (پیرس) میں سے میں نے پوچھا، تم نے کبھی کسی مرد سے محبت بھی کی ہے۔ بیچاری میرا منہ تکنے لگی "محبت؟" اس نے کہا۔ میں تو دن رات میں چار چار مردوں سے "محبت" کرتی ہوں۔ جو کوئی میرے گھر آتا ہے۔ اس سے محبت کرتی ہوں، تیرہ برس کی عمر میں یہ پیشہ اختیار کیا—— اختیار کرایا گیا——

اس وقت سے میں نے یہی سیکھا کہ ہر مرد جو آئے اس سے "محبت" کرنی چاہیئے—— جب تک وہ ٹھہرے۔ دس منٹ، دو گھنٹہ یا دو مہینہ۔ میں نے کہا، عجب بیوقوف ہو، میں ایسی محبت کا ذکر نہیں کرتا، اصلی محبت، اصلی! ہنسنے لگی—— کیا؟ محبت کی بھی قسمیں ہیں! اصلی بھی ہوتی ہے اور نقلی بھی؟ میں نے کہا۔ "بے وقوف چھوکری!" وہ ہنستی رہی، "تو صاحب، یہ نئی بات سنی، محبت کی بھی دو قسمیں! اصلی بھی اور نقلی بھی جیسے میرا زیور، بہت سا نقلی ہے، اور کچھ اصلی ہے! آپ کے ملک میں

دو قسم کی محبت ہوتی ہے واہ سیٹھ صاحب واہ! خوب ہنسی۔ خوب ہنسی! میں بھی ہنسا۔ ہنستا نہ تو کیا کرتا۔ کچھ عبرت بھی ہوئی، شرم بھی آئی! پھر میں نے کہا مجھے کیا۔ میں نے عورتوں کی ہمدردی کا ٹھیکہ تو لیا نہیں۔ جب وہ نہیں جانتی کہ محبت کیا ہے؟ تو اچھا ہے نہ جانے۔

---

۱۶ جولائی ۱۹۲۹ء

ایک دن بمبئی میں ایک صاحب بہت ہی گھبرائے ہوئے آئے کہنے لگے سنا آپ نے؟ نجومیوں نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ ۱۸ تاریخ کو پھر بہت بڑا زلزلہ آنے والا ہے جس کا رخ زیادہ تر بمبئی کی طرف ہوگا اب کیا کرنا چاہیے جناب! میں نے کہا غلطی تو آپ ہی لوگوں کی ہے۔ اب صلاح لینے سے کیا فائدہ؟ وہ کہنے لگے خدا کیلئے! ہماری کیا غلطی ہے؟ میں نے کہا سارے مکانات آپ لوگوں نے زمین پر بنا ڈالے یہ غلطی کچھ کم ہے۔ اگر پہلے ہی نیچے مکانوں کو زمین سے دو گز اوپر بناتے تو پھر زلزلہ آیا کرتا، زمین ہلا کرتی، آپ بے فکر رہتے! آخر مکانوں کو زمین سے چپکا کر بنانے ہی کی کیا ضرورت تھی؟ بیچارے سمجھے کہ میں نے کوئی پتہ کی بات کہی، سوچنے لگے، پھر دوسرے لوگوں کو مسکراتے دیکھ کر کچھ سمجھے، کہنے لگے۔ واہ صاحب! واہ! یہاں تو جان پر بن رہی ہے اور آپ کو دل لگی سوجھی ہے!

جان بہت ہی قیمتی چیز سمجھی جاتی ہے —— جان! حالانکہ وہ انسان کے وجود میں سب سے کم قیمت چیز ہے۔ جو چیز اپنی نہ ہو، اپنے قابو کی نہ ہو اسکی

قیمت ہی کیا؟ لیکن ایک دنیا ہے کہ اِس "جان" کو اپنی "جان" سمجھ رہی ہے باوجودیکہ یہ بھی خبر نہیں کہ وہ ہے کیا؟ کہاں ہے، کہاں سے آتی ہے، کہاں جاتی ہے۔ جب وہ جانے لگتی ہے تو ایک لمحہ بھی آپ اس کو روک نہیں سکتے! پھر بھی وہ آپ کی ہے سچ پوچھئے تو انسان کی جنس کائنات میں احمق ترین جنس ہے۔ سرتاپا احمق کامل! پھر اِس پر اشرف المخلوقات ہونے کا دعوٰے! دعوٰے دنیا کی خلافت اور حکومت کا! حالانکہ حکومت کا تو یہ حال ہے کہ اپنے ہی جسم کی ایک انگلی پر قابو نہیں۔ سائنس ہے، طب ہے، علم و عقلی و نقلی ہیں۔ کہیں کرۂ ہوائی فتح کیا جارہا ہے، کہیں سمندروں کی بادشاہت کا اعلان ہے۔ کہیں لوہے اور بجلی کے مصنوعی انسان بنائے جارہے ہیں۔ کہیں کتوں اور خرگوشوں کو مار کر زندہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ کوئی مریخ تک سفر کرلینے کا تہیہ کر رہا ہے، کوئی انسان کی عمرِ طبعی میں اضافہ کرنے کی ترکیبوں پر غور کر رہا ہے! ـــــ لیکن ـــــ کرۂ ہوائی اور سمندر کے بادشاہ سلامت اور مریخ کے مسافر سب کا دم پٹ سے نکل جاتا ہے اور لمبے لمبے لیٹ جاتے ہیں۔

دیوانے بے وقوف گدھے!!

---

۱۷ جولائی سنہ ۱۹۲۹ء

شام میاں اختر بہت ہی سنجیدہ صورت بنائے ہوئے آگئے مجھ سے کہا، کچھ مشورہ کرنا ہے، تخلیہ میں ـــــ اِن کی سنجیدہ صورت دیکھ کر میں تو سمجھا کسی نئی ماہ پارہ کی خبر لاتے ہونگے لیکن وہ اپنی حماقت کا ایک نیا

شگوفہ لے کر تشریف لائے تھے۔ کہنے لگے میری والدہ کی رائے ہے کہ میں شادی کرلوں، تمہاری کیا رائے ہے؟ میں نے کہا معاف کرنا۔ اگر آپ کی والدہ یہ فرمائیں کہ میری (یعنی ان کی) یہ رائے ہے کہ میں (یعنی وہ) شادی کر کے اپنی بیوگی اور آپ کی یتیمی کا زمانہ ختم کر دیں تو زیادہ مناسب ہوتا۔ مگر یہ کیا کہ شادی آپکی اور رائے والدہ کی، دنیا میں انسان کو موت ایک دفعہ نہیں آتی۔ دو دفعہ آتی ہے۔ آدھا پہلی چوٹ میں مرتا ہے اور باقی آدھا دوسری چوٹ میں، پہلی موت تو وہ ہوتی ہے جب اس نے ازدواج کی بیڑی اپنے پاؤں میں ڈالی۔ سمجھئے کہ جوانی اور نصف زندگی کا خاتمہ ہو گیا ـــــــ اور خاتمہ بھی بالخیر نہیں! شب عروسی سے بڑھاپے کا دور شروع ہوتا ہے یعنی دوسری اور آخری موت کی تمہید! تم دیوانے تو نہیں ہو گئے کہ عین جوانی میں شادی کی۔ اپنی والدہ سے کہو۔ میرا بیاہ رچانا ہے تو کچھ دن اور زندہ رہئیے۔ ۹۰ برس کی عمر ہو جائے قوی ہونے لگیں سست، چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے میں ہانپنے لگوں، تب وقت آئے گا کہ میرا سہرا تیار کیا جائے ـــــــ ابھی تو ان باتوں کی فرصت نہیں کہا کیوں نہیں تم نے؟ اختر کہنے لگا کہ میری والدہ کہتی ہیں کہ تیری اولاد دیکھنے کی بہت تمنا ہے اور زندگی کا اعتبار نہیں ـــــــ زندگی کا اعتبار نہیں یہ تو تمہاری والدہ کی بالکل جدید تحقیقات ہے، میاں اختر! ۸۰ برس اس دنیا میں گزارنے کے بعد ان کو معلوم ہو گیا کہ زندگی کا اعتبار نہیں! تمہاری والدہ تو لقمان کی والدہ سے کم نہیں ـــــــ اب رہا اولاد کی تمنا کا سوال، تو مرد خدا صاف صاف کہہ کیوں نہیں دیتا کہ اولاد کی اب کیا کمی ہے جو اس کے لئے شادی کی جائے ـــــــ تیرے کتنے ہی بچے گلیوں میں مارے مارے پھر رہے ہونگے ان میں سے

ایک کو پکڑ کر نے جا اور دکھا دے۔ لو اماں! اولاد تو یہ موجود ہے —— میری جوانی کی محنتوں کا زندہ نتیجہ! دو چار پوتی پوتے اِن کے حوالے کر دے، میٹھی پالا کریں —— اختر نے کہا تم اِس وقت اپنی طبعی سنک میں ہو، جانے دو اِس ذکر کو، میں نے کہا، یہ تو نہ ہوگا، تو نے اب ذکر چھیڑا ہے۔ تو سُن! شادی کے متعلق تجھے میرے خیالات معلوم ہیں۔ اب میں کہتا جاؤں تو لکھتا جا! جا کر اپنی اماں جان کو سُنا دینا! ——

۱۸ر جولائی ۱۹۲۹ء

کل جو اختر نے اپنی شادی کا ذکر چھیڑا۔ اور میں نے حضرت کی مزاج پرسی کی تو بھاگے۔ مگر میں کہاں جانے دیتا ہوں، پکڑ بٹھایا اور کہی ان کہی سب ہی کہی! کیسے فرمانبردار فرزند ہیں بے چارے! اماں کہتی ہیں بیاہ کر لے، سعادت مند کہتے ہیں، بہت خوب اماں! —— اماں کہیں جا بیٹے کنوئیں میں ڈوب مر، یا تھوڑی سی سنکھیا کھالے، یا اپنی ناک کاٹ کر بازار میں ناچ تو بھی فرزند دل بند شفقتِ مادری کے جواب میں فرمانبرداری پر کمر بستہ ہو جائیں گے واہ رے ہندوستان جنت نشان کے بیٹو! اور واہ رے یہاں کی کالی کالی اماؤں!!

میں نے کہا، میاں اختر! جوانی میں بیاہ کرنا ایسا جیسے ہرن نے اپنے پاؤں میں نعل ٹھکوا لیے، اور بڑھاپے میں ایسا جیسے بکرے کی داڑھی پر مہندی لگالی

آخر نکاح کا منشا کیا ہے؟ اگر منشا افزائش نسل ہے۔ تو یہ بغیر نکاح اور برات کے بھی ممکن ہے اور اگر منشا "سماج" کا انضباط ہے تو وہ بھی "دو بول" پڑھ دینے پر منحصر نہیں، یہ سب باتیں تو اشخاص کی ذہنیت پر منحصر ہیں۔ اور ازدواجی پابندی تو اس قدیم عہد کی یادگار ہے، جب دو انسان بیلوں کی طرح ایک مادہ کے لئے لڑتے تھے جب معمولی خانگی ضروریات میں سے ایک عورت بھی تھی لیکن اب تو ضرورتیں بدل گئی ہیں۔ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کی نوعیت بھی بدل گئی ہے، اب اپنے گھر میں روشنی کرنے کے لئے کوئی شخص نہ بازار سے تیل لاتا ہے۔ نہ چراغ جلاتا ہے بجلی کا ایک ہی تار سارے شہر میں پھیلا ہوا ہے اور ہر شخص ایک بٹن دبا کر اپنی ضروریات کو رفع کر لیتا ہے، زیادہ متمدن دنیا کے لوگ تو گھروں میں باورچی خانہ کا دھندا بھی ناپسند کرتے ہیں، بھوک لگی۔ سر راہ ہوٹل میں گئے کھا لیا حقہ بھرنے، تازہ کرنے، سلگانے کا جھگڑا ہی ختم ہو گیا، سگریٹ کی ڈبیا جیب میں ہے —— رہا اولاد کا سوال تو —— میں نے کہا —— بے وقوف! اگر تازے تازے پھل بازار میں بکثرت میسر آسکتے ہیں تو باغ لگانا۔ درختوں کا پرورش کرنا اور آبیاری کی دردسری برداشت کرنا حماقت نہیں تو کیا ہے؟ پہلے لوگ مچھلیاں پکڑنے دریا پر جاتے تھے۔ دن بھر کی سردی یا گرمی کی تکلیف اٹھاتے تھے، تب رات کو ایک مچھلی پکڑ کر کھاتے تھے۔ اب پکڑی پکڑائی مچھلیاں، اچھی سے اچھی ٹین کے ڈبوں میں بند جہاں چاہو خرید لو اور کھا لو، پھر جو تم دریا کے کنارے بیٹھ کر اونگھو تو تم سے زیادہ گدھا کون؟ رہا غلہ، سو غلہ یا پھل پیدا کرنے کے لئے یہ کیا ضرور ہے کہ زمین کی زمینداری کے تمام حقوق بھی حاصل کئے جائیں ——

میں نے کہا ـــــ اپنی اماں سے کہو کہ امّاں جانی! غلطی یہ ہوئی کہ آپ اپنے زمانے کے بعد زندہ ہیں، قافلہ جا چکا، تم پیچھے رہ گئیں، اب دو وقت روٹی کھائے جاؤ اور دن گذارتی رہو، جس دریا میں تیر نہ سکو اس کے پانی سے دُور رہو! ـــــ درحقیقت انسانوں کی زندگی کی بڑی ٹریجڈی یہی ہے کہ ان کا زمانہ گذر جاتا ہے۔ ماحول بدل جاتا ہے اور وہ باقی رہ جاتے ہیں، آخر عمر میں تو وہ پرانے ہوتے ہیں۔ اور دنیا نئی۔ کہاں جائیں کیا کریں، کوئی ان کی بات نہیں سمجھتا۔ کوئی ان کو پہچانتا نہیں ـــــ اُلّو کی طرح کسی ویرانے میں بیٹھے اونگھا کرتے ہیں۔ نئی دنیا ان کی سمجھ میں آتی نہیں اور جب خواہ مخواہ وہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو لوگ ان پر ہنستے ہیں اور ان کی خاک سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں ہنستے ہیں! ـــــ میں نے کہا اختر، نکاح اور ازدواج کی پابندیاں عہد قدیم کی تاریکیوں کی یادگار ہیں، مہذب دُنیا اب ان لغویات سے آزاد ہوتی جاتی ہے اور جنگ عظیم کے بعد تو عورت اور مرد کے جنسی اور اجتماعی تعلقات کا ایک بالکل نیا تجربہ روس میں کیا جا رہا ہے۔ وہاں خانگی اور خاندانی پابندیاں یکسر مٹائی جا رہی ہیں اور زندگی کا سارا نقشہ بدلا جا رہا ہے تم پڑھے لکھے نوجوان ہو۔ تم کو سمجھنا چاہیئے کہ عہد جدید کے در و بست میں تمہاری اماں جان کا وجود محض بے ضرورت بلکہ ایک حد تک خارج اور مخل ہے۔ یہ مجبوری ہے کہ وہ زندہ ہیں اور زندہ رہنے پر اصرار کرتی ہیں۔ لیکن سانس لینے اور روٹی کھانے کے علاوہ ان کے تمام حقوق ساقط ہو چکے ہیں، اس قسم کے ماں باپ اس زمانہ میں چھٹی انگلی یا اپنڈی سائٹس کی طرح ہیں ـــــ بیکار مگر موجود! ـــــ اختر کہنے لگا خدا کے

لیے اِس لیکچر کو ختم کرو۔ میں نے کب کہا تھا کہ بیاہ کرتا ہوں، میں نے تو کہا تھا۔ کہ امّاں کا یہ خیال ہے ——— مگر ——— وہ کہنے لگا ——— میں نے دہیں اس کی زبان پکڑی، اگر مگر کچھ نہیں! میں سمجھتا ہوں، تمہارے منتشر دماغ میں جو احمقانہ خیالات آرہے ہیں! میاں بیوی کی اُلفت کے خواب اگر تم دیکھ رہے ہو تو یاد رکھو، میاں بیوی صرف وہی خوش رہتے ہیں جن کے تعلقات میں اصطلاح کا دخل نہ ہو جس کو ——— محض اس لیے کہ کوئی دوسرا الغوز لفظ میسر نہیں آتا ——— "محبت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ عورت اور مرد کے تعلقات اسی وقت تک پرکیف ہوتے ہیں۔ جب تک کہ ان دونوں کے درمیان نکاح کا واسطہ قائم نہ ہو جاتے! ——— اگر ایک دروازے سے قاضی صاحب نکاح پڑھانے تشریف لاتے ہیں تو یقین جانو۔ کہ دوسرے دروازے سے سارا لطفِ زندگی نکل کر بھاگتا ہے! دونوں ایک جگہ نہیں ٹھہر سکتے ——— نکاح اور لطفِ زندگی! عورت جب تک خالص عورت ہے اور مرد جب تک خالص مرد ہے ——— نہ وہ بیوی ہے نہ یہ شوہر ——— اس وقت تک زندگی میں مزا ہے اور جب "قبول کیا میں نے اس کو" درمیان میں آیا تو دو اچھے خاصے انسان میاں بیوی بن کر رہ گئے! ——— خشک، چڑچڑے، لڑاکا، آزادی، یکساں بھنکتے ہوئے منہ ٹیڑھے!

——— اختر کچھ گرملاتے کہنے لگے جو منہ میں آتے بکے جاؤ، مگر ہمیں تو یاد ہے، ابھی دو تین ہی مہینے ہوتے کہ تم "لیلیٰ" سے نکاح کرنے کے لیے مرے پھرتے تھے، اِس وقت کہاں تھا یہ فلسفہ اور کہاں تھیں یہ موشگافیاں ——— !میں

نے کہا ـــــــ عارضی دیوانگی قانون کا ایک مسلمہ مسئلہ ہے، اس حالت میں لوگ خودکشی کر لیتے ہیں۔ قتل کر ڈالتے ہیں۔ گالیاں دیتے ہیں، اینٹیں مارتے ہیں!

ـــــــ وہ سب عقل کا فتور ہے ـــــــ یہ کیا دلیل لائے تم ـــــــ

اختر ہنس کر کہنے لگا، اگر وہ دیوانگی کا دورہ تھا۔ تو پھر بھی ہو سکتا ہے۔ وہ دورہ کسی دن دوبارہ پڑ لیگا۔ ایک گھروالی گھر میں لا کر بٹھا دوگے، پھر ہم کرینگے بستر سلام

ـــــــ میں نے کہا بھاگ! اُلّو کہیں کا!

۲۹ جولائی ۱۹۲۹ء

قدموں کی آہٹ پہچانتا ہوں ـــــــ مطلوب و مقصود جب اونچی ایڑی کی جوتیاں پہنے کھٹ کھٹ کرتا آتا ہے، تو میں دور سے پہچان لیتا ہوں کہ یہ کھٹ کھٹ جانکی بائی کی ہے یا رادھا بائی کی، یا زینت جان کی ـــــــ مگر جب قدموں کی آواز ہوتی ہے۔ گُھر۔ گُھر، تو میرے اعصاب پہ چوٹ لگتی ہے اور متلی شروع ہو جاتی ہے ـــــــ اب وہ آرہے ہیں ـــــــ میز پر سے گلاس دلاس اُٹھا کر پلنگ کے نیچے رکھ دیتا ہوں، کوئی بی صاحب جلوہ افروز ہوتی ہیں تو اُن سے کہتا ہوں، نیک بخت ذرا دوسرے کمرے میں چلی جاؤ، اپنا پاندان بھی لیتی جاؤ، آب آمد تیمم برخاست ـــــــ اس طرح وہ تشریف لاتے ہیں ـــــــ مولانا خیر الزماں صاحب ـــــــ جب وہ آتے ہیں۔ تو میرا دل چاہتا ہے ـــــــ کیا بتاؤں کیا چاہتا ہے! مولانا کھانستے کھنکارتے

گلے کے بلغم کی ڈھیریاں سارے صحن میں اور سیڑھیوں پر جماتے۔ پیک کی پچکاریاں مارتے، داڑھی کھجلاتے تشریف لاتے ہیں ــــــ السلام و علیکم ــــــ ابتدا اس دعا سے ہوتی ہے ــــــ سلامتی ہو تم پر ــــــ

مذہب، مذہب! مکر، مکر! مغرب ہو یا مشرق، زور، حیلہ، فریب، یہ سب ہماری زندگی کے جزو لاینفک ہو کر طبیعت ثانیہ ہو گئے ہیں۔ کچھ مذہب نے سکھایا کچھ تمدن نے، مگر اہل مذہب پر زیادہ الزام اس لئے کہ وہ صداقت اور پاکی کے مدعی ہو کر مکر و زور کے مرتکب ہوتے ہیں "السلام علیکم" کہتے ہیں اور اس کے ساتھ "ورحمتہ اللہ و برکاتہ" بھی ــــــ مگر جو زبان سے کہتے ہیں ــــــ اس کے بالکل برخلاف دل میں ہوتا ہے۔ زید سے ملاقات ہوتی ہے۔ دل کہتا ہے مر جائے یہ شخص، تباہ ہو جائے، مٹ جائے اور زبان کہتی ہے سلامتی ہو تم پر" دل کہتا ہے اس کو زہر بھرا ایک پیالہ پلا دو، زبان کہتی ہے "عمرت دراز" دل کہتا ہے اس مردود کی بوٹیاں نوچو، زبان کہتی ہے، خدا سلامت رکھے" یہ حقیقت ہے اس پاکیزگی نفس اور خلوص قلب کی، جس کی تعریف مشرق میں مذہب اور مغرب میں معلم اخلاق دیتا ہے! دل کی بد دعائیں زبان پر دعائیں بن کر آئیں۔ اور زہر شربت کی شکل میں پیش کیا جائے ــــــ اس کا نام ہے اخلاقِ حسنہ! ہمارے مولانا "السلام علیکم" کہتے ہوئے آتے ہیں اس لئے ان کو اپنے مدرسہ کے لئے مجھ سے چندہ لینا ہے۔ ہم وعلیکم السلام کہہ کر مصافحہ کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ابھی تک مذہب اور عاقبت کا ایک بے معنی خوف ہمارے دلوں میں باقی ہے ــــــ عقل کہتی ہے کہ مذہب، محض ایک ڈھونگ ہے

مگر کمزور دل لرزتا ہے کہ جنت، دوزخ کی باتیں کہیں واقعی صحیح نہ ہوں کہیں مرنے کے بعد سچ مچ دوزخ کی کھڑکیاں قبر میں نہ کھل جائیں، ہم سے تو وہی بے وقوف اچھے جو آنکھیں بند کرکے مذہب کی پیروی کرتے ہیں، زیادہ اچھے جو صاف صاف مذہب کے منکر ہیں، ان کو کچھ بھی نہیں تو ایک قسم کی یکسوئی تو حاصل ہے۔ ہم لوگ تو ادھ بھر میں معلق ہیں ——— نہ نتر نہ بٹیر! ——— اصل یہ ہے۔

انسانی زندگی کی ابتدائی سادگی اور پاکیزگی اتنے جالوں اور پھندوں میں پھنسا دی گئی ہے کہ ان جالوں کے کتنے ہی خانے توڑ ڈالو پھر بھی پھندے باقی رہ جاتے ہیں۔ ویسے اخلاق سب مذاہب دیتے ہیں مگر مذہب والوں میں عقل کی توفیق کم پیدا ہوتی ہے ——— "علیکم السلام" مولانا تشریف لائے ——— میں نے کہا ——— (دل کہتا تھا کہ یہ بے وقوف کیوں میرے اوقات کو خراب کرنے نازل ہو گیا) ——— خیر حضرت مولانا تشریف لائے بیٹھے۔ دو تین پان منہ میں کھونسے، اگالدان کو بلغم سے بھرا، پھر کہنے لگے ——— کیوں میاں! کبھی تم نے تاریخ اسلام کا بھی مطالعہ کیا، نفسیات کے نقطۂ نظر سے؟ میں نے کہا جی ہاں! میں دنیا کی تمام بڑی اقوام کے نفسیات کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ فرمایا تم نے مسلمان اور دیگر اقوام کی نفسیات میں کیا فرق پایا؟ میں نے کہا، کچھ بھی نہیں سب یکساں ہیں، جو عیب ایک میں ہے۔ وہ باقی سب میں بھی ہے۔ ——— کم و بیش ——— اشکال مختلف ہیں ——— ماہیت ایک ہے

کہنے لگے۔ ہائیں! پھر تم نے کیا خاک مطالعہ کیا ——— ؟ میاں اسلام کی تعلیم کو دیکھو اور دوسرے مذاہب کی تعلیم کو۔ زمین و آسمان کا فرق ہے! میں نے کہا ہوگا

الفاظ مختلف ہیں، زبانیں مختلف ہیں، اسلوب بیان بھی مختلف ہے۔ مگر اچھی باتیں اور بری باتیں سب مشترک ہیں اور ایک چیز سب ہی میں مشترک ہے۔ ——— کہنے لگے ——— وہ کیا؟ میں نے کہا وہ یہ کہ عمل خیر کی طاقت واستعداد کسی میں نہیں۔ مگر تصنع سب میں ہے۔ اچھی باتیں جو ہیں وہ بے اثر ہیں۔ بری باتیں عام ہیں! پادری، راہب، اسقف، پنڈت، مولانا، لباس مگر سب کے جسم پر ہے دل میں کچھ ہی ہو عمل میں ضعف ہے اور تصنع؟ ان نفسیات کے متعلق میرا مطالعہ تو صرف اتنا ہے کہ سب کے سب نفس کے بندے ہیں ——— سوائے ان چند کے جو دنیا سے قطع تعلق کر کے ہمالیہ کے کسی غار میں منہ چھپائے پڑے ہوں ——— سو راستہ ان کا بھی صحیح نہیں وہ کوہ نشین معتکف ہم سے بھی زیادہ بزدل ہیں ——— دنیا کو سنبھال نہ سکے تو دم دبا کے بھاگ گئے ——— مولانا کھانے! اجتناب شروع کرنے سے پہلے کھانسا کرتے ہیں ——— بھائی میرے ——— وہ بولے ——— پھر کیا تم دہریہ ہو گئے؟ لامذہب ہو گئے؟ میں نے کہا حضرت! نہ دہریہ ہوں نہ لامذہب، مسلمان ہوں بالکل ایسا ہی جیسے سب ہیں ——— فرق صرف اتنا ہے کہ وہ کہتے نہیں، میں صاف صاف کہتا ہوں! دونوں عیدوں کی نماز عیدگاہ میں پڑھتا ہے بکرے کا گوشت کھاتا ہوں۔ بہت سخت قسم کا ہمدرد قوم ہوں۔ یعنی یہ حال ہے کہ قطب شمالی پر اگر کسی مسلمان بھائی کے اسلامی ناک میں ٹھنڈی ہوا گھس جاتی ہے تو مجھے اپنے آتشدان کے سامنے چھینکیں آنے لگتی ہیں ——— اگر ٹمبکٹو میں کسی مسلمان کا پاؤں پھسل جاتا ہے تو یہاں میرے جوتے میں ایک تکلیف وہ کیل نکل آتی ہے! مسلمانوں کو

میں "خوابِ غفلت" سے بیدار کرنے کا اسلامی فرض بھی عنقریب انجام دینے والا ہوں
ــــ ذرا جوانی کے کاموں سے فارغ ہو لوں، بڑھاپے کا گھنٹہ بجتے ہی لیڈر
قوم بن جاؤں گا، تمام مُردوں کو قبروں میں بیدار کر دوں گا ــــ مولانا بڑے
ارادے ہیں میرے ــــ پھر میں نے کہا ــــ لفافہ خالی ہے مولانا، اس
پر کیوں مہریں لگائی جا رہی ہیں ــــ گھوڑا مردہ ہے، ناحق آپ لوگ کوڑے مار
رہے ہیں ــــ روٹی کمائی کسی نہ کسی طرح، کچھ "کارِ خلوت" بھی کئے جائیے
ــــ چاہے مذہب کی آڑ میں چاہے ہم زندانِ بلاکش کی طرح ــــ
جب وقت آئے چلے جائیے ــــ جہاں سے آئے تھے ــــ
ــــ معلوم نہیں کہاں سے آئے تھے ــــ باقی سب جھگڑوں
کو چھوڑ دیئے جا ــــ

مولانا نے گفتگو کا رُخ بدلا، کہنے لگے، تم نے سنا شہر میں طاعون شروع
ہو گیا ــــ میں نے کہا الحمدللہ! پانچ سات برس میں جب ایک دفعہ حضور
وائسرائے یا گورنر بہادر اس طرف آ جاتے ہیں۔ تب تو شہر کی سڑکیں درست
ہو جاتی ہیں اور نالیاں دُھل جاتی ہیں، اسی طرح دو چار برس میں جب طاعون آتا
ہے تو شہر کی صفائی کا کچھ انتظام اور اہتمام ہو جاتا ہے۔ ان ہی دو کی وجہ سے شہر
کی غلاظت کی مقدار کبھی کبھی کم ہوتی رہتی ہے! الحمدللہ نہ کہوں تو کیا کہوں ــــ
مولانا کہنے لگے۔ میاں تم سے بات کوئی کیا کرے۔ اُلٹی کہتے ہو۔ سیدھی تو کہتے ہی نہیں
اچھا یہ بتاؤ طاعون کا ٹیکہ لگوایا جائے یا نہیں میں نے کہا حضرت مولانا! اس زمانہ میں اُلٹی باتیں ہی
سیدھی ہیں! سیدھی بات تو بیوقوفی کی بات ہے ٹیکہ کی ضرورت آپکو بالکل نہیں! مجھے ہے کہنے لگے کیوں؟

میں نے کہا آپ پچاس کی عمر سے گذر چکے اور میں ابھی تیس کی منزل پر بھی نہیں پہنچا۔ آپ کے انتقال سے دنیا کا کوئی نقصان نہ ہوگا اور میں ابھی گاڑی کھینچنے کے قابل ہوں فطرت کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہوں۔ مجھے کچھ روز ٹھہرنے دیجئے آپ آگے جائیے، "دراصل ہم اور آپ فطرت کے رازوں سے واقف نہیں، وہ وقتاً فوقتاً دریاؤں، طوفانوں، زلزلوں اور جنگ وجدل کے ذریعے سے گھر کی صفائی کرتی رہتی ہے۔ اس کے جھاڑو میں جس قدر خاشاک جاتی ہے۔ اس کو لپیٹ کر کوڑا گھر میں پھینک دیتی ہے، اس جھاڑو کا مقابلہ زمین پر پھیلے ہوئے تنکے نہیں کر سکتے طاعون ایک بہت معمولی اصطلاح ہے۔ اس سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ دو چار دن کا بخار اور گلٹیوں کا درد اس سے تو بہتر ہے کہ ستر برس کی عمر میں آپ ذیابیطس، گنٹھیا، ضیق النفس، سلسل البول اور خدا جانے کتنی بلاؤں میں گرفتار ہوکر ایڑیاں رگڑیں اور آپ کے اہل وعیال تیمارداری کرتے کرتے پریشان ہو جائیں، دوست، احباب عیادت کرتے کرتے تنگ آجائیں۔ اطبّا نسخے لکھتے لکھتے تھک جائیں اور بڑی مشکل سے آپ کی روانگی کا وقت آئے ——— بیل گاڑی کا سفر کیوں کیجئے جب کہ آپ ایکسپریس یا طوفان میل میں سوار ہو کر جا سکتے ہیں!!

ہمارے مولانا ہنس دیئے۔ میں بھی ہنس دیا ——— پھر وہ اپنے بچے بچیوں کا ذکر کرنے لگے۔ یہ تذکرہ ان کو بہت عزیز ہے اور ماشاء اللہ بچوں کے متعلق مولانا کا نظام الاوقات بھی بہت مرتب اور منظم ہے۔ ہر گیارہ مہینے کے شروع اور آخر میں لہٰذا کر ڈریں ایک کا اضافہ مولانا کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور اس میں کبھی تاخیر نہیں ہوتی! ایک بجنت ملاقی جی مولانا سے اس معاملہ

میں پورا تعاون کر رہی ہیں۔ دیکھیئے کب تک مولانا کا یہ خیر جاریہ قائم رہتا ہے ——— !

بچے مولانا کے سب بہت حسین ہیں ——— کوئی کانا، کوئی کالا، کوئی بہرا، کوئی لنجا! ——— مگر مولانا کو اس کی ذرا بھی پروا نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے بعد وہ سب اسی خاندانی مسند رشد و ہدایت پر جلوس کریں گے اور جب تک جبہ و عمامہ کا اثر لوگوں کے دلوں میں باقی ہے ایک آنکھ یا ایک ٹانگ یا دو ٹانگ کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا اللہ کے خالص بندے فانی اور جسمانی حسن صورت کے محتاج کب ہوتے ہیں اپنے خیال میں مولانا اسلام کی ایک بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں اور یہی کافی ہے ——— غرض یہ کہ مولانا نے دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھایا، جب میں ستار لے کر بیٹھا۔ اور مولانا سے کہا کہ سنئے کوئی گت تو وہ لاحول پڑھتے ہوئے اُٹھ گئے۔

۹ راگست ۱۹۲۹ء

پرسوں رات، کل رات، گذشتہ رات، تین دن مسلسل اس دنیا میں نہ تھا جو اخلاق و آداب اور احتیاط و اعتدال کی دنیا ہے بلکہ اس دُنیا میں دنیا میں تھا جہاں احتیاط اور اعتدال کی دنیا ہے۔ جہاں نہ ماضی ہے نہ استقبال، حسن ہے، عیش ہے اور حال ہے! آج ذرا پلنگ پر پڑا ہوا تکان دور کر رہا ہوں!

کاش کہ عیاشی میں لگان ہوا ہی نہ کرتی۔ اِن تین راتوں کا خمار ہنوز سر میں ہے اور تصور کا دامن ہاتھ میں، ایک عورت پھر میرے اندر ایک تازہ "طلب" پیدا کر رہی ہے —— کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے اہیں ابھی پڑا ہوا سوچ رہا تھا۔ کہ اگر میرے ساتھ حُسن کی آویزشوں کا سلسلہ "لیلے" کے واقعات کے بعد بھی جاری رہ سکتا ہے —— تو پھر اِس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ "لیلے" کے متعلق میری وارفتگی جس کو میں اِس وقت محبت سمجھتا تھا طلب عیش کے چڑھتے ہوئے دریا کی صرف ایک موج تھی —— اور کچھ بھی نہیں۔ کیا میں دھوکہ کھا رہا تھا جب یہ سمجھتا تھا کہ اِس عورت نے پہلی مرتبہ میرے قلب پر محبت کی خاتم سلیمانی ثبت کی ہے اور وہ چیز مجھے دے دی ہے۔ جس کو اہل دل "عشق و محبت" کہتے ہیں! دنیا کا ہر کوتاہ نظر ظاہر پرست یہی کہے گا کہ میری حُسن پرستی کا یہ مسلسل دورِ ہوس کا ایک ہنگامہ ہے۔ ہر چندہ دن میں ایک نئی عورت کی طلب اصطلاحی طور پر ہوس ہی ہوس کہی جاتی ہے مگر میں نے اِس نکتہ کو دوسری طرح حل کیا ہے۔

انسانیت کا وہ جوہر لطیف۔ "دُرِّ بے قیمت" —— محبت —— ہر عیاش اور رند کے قلب میں موجود ہے اور عورت بہ عورت منتقل ہوتی رہتی ہے یعنی ہر عورت جو اِس عیاش کے آغوش میں آتی ہے ایک شب یا چند روز کیلئے اِس "دُرِّ بے قیمت" کی حامل رہتی ہے پھر جب مرد کسی دوسری عورت کی طرف مائل ہوتا ہے تو وہ "دُرِّ بے قیمت" بھی اسی طرف منتقل ہو جاتی ہے —— اور اسی طرح منتقل ہوتی رہتی ہے —— عورت بہ عورت —— منزلیں طے کرتی ہوئی وہ "دُرِّ بے قیمت" آخر اِس عورت تک پہنچتی ہے۔ جو اُس کی مقصود ہے اور وہیں مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے ——

—— وہ اپنی آخری منزل پر پہنچنے کے لئے بہت سی منزلیں طے کرتی ہے۔ پس یہ کہنا کہ ایک ہوس پرست عیاش نورِ محبت سے محروم ہے اور اس کے آغوش میں جو عورتیں آتی ہیں وہ بھی محروم رہتی ہیں۔ صحیح نہیں اصل یہ ہے کہ وہ سب کچھ بقدرہ کی محبت سے تھوڑا بہت حصہ پاتی ہیں۔ مگر ہاں، ان کے وجود میں وہ محبت قیام پذیر نہیں کرتی —— گندتی رہتی ہے —— تاآنکہ آخری عورت تک پہنچے —— میری وہ آخری عورت کون ہو گی۔ معلوم نہیں —— یا وہ آخری عورت کے لئے ہے (بادش بخیر) جس کی طرف میں پھر لوٹنے والا ہوں! —— معلوم نہیں، اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ آخر کار میرے اس دریا کا سارا بہاؤ کسی ریگستان میں جا کر خشک ہو جائے۔ گم ہو جائے۔ ختم ہو جائے اور میری "برقیت" کی یہ لہر کسی آخری نقطہ —————————— تک پہنچنے ہی نہ پائے!

ابھی تو یہ لفافہ ڈاک میں ہے —— گند رہا ہے —— ایک تھیلی سے دوسری تھیلی میں ایک ڈاکخانہ سے دوسرے ڈاک خانہ میں ——

ایک دن اختر کو میں نے اپنی عیاشی کا یہ فلسفہ سنایا۔ وہ کہنے لگا —— پڑھا لکھا پاپی اپنے پاپ کی توجیہ و تاویل خوب کر لیتا ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا یہ لفافہ ڈاک میں چلتے چلتے یونہی لاپتہ ہو جائے گا! کوئی ڈاکیہ کسی نالی میں پھینک دیگا۔ وہ نالی اس لفافہ کو بہا کر چہ بچہ میں لے جائے گی —— کوئی خاکروب چہ بچہ سے نکال کر اُس کو کھاد میں شامل کر دے گا —— نورِ محبت کی شعاعیں بڑھاپے کی ظلمت میں فنا ہو جائیں گی —— یا یہ "برقیت" اس طرح عورتوں میں تقسیم ہوتے ہوتے ختم ہو جائیگی بارود گیلی۔ آتش خانہ

سرد! زندہ رہے تو ـــــــ وہ کہنے لگا ـــــــ ہم دیکھ لیں گے کہ جب گناہ کی طاقت باقی نہ رہے گی۔ تو توبہ توبہ کر مرگے۔ کسی نیک بخت لڑکی کو شریکِ زندگی بنا لیں گے اور ممکن ہے کہ آخر عمر کی کمزور کوششیں ایک دو بچے بھی پیدا کریں ـــــــ آپ بیٹھے ہوئے اونگھا کریں گے۔ اور اپنے باپ دادا کی طرح اونگھتے اونگھتے ہی کسی دن چار آدمیوں کے کندھوں پر سوار ہو جائیں گے ـــــــ کہاں کی "برقیت" اور کہاں کا نورِ محبت! میں نے کہا۔ میاں اختر! تم جوان بھی ہو، عیاش بھی ہو، یہ سب باتیں اچھی ہیں مگر تمہیں اس فن کی "عرفانیات" سے ذوق نہیں! اس کا افسوس ہے! تمہارے نزدیک انسان کی زندگی کا ایک نظام مکمل و مرتب ہے ـــــــ پیدا ہو گا۔ جوان ہو گا۔ عیاشی کرے گا۔ بڈھا ہونے لگے گا۔ توبہ کرے گا۔ پھر ایک بیوی مہیا کرے گا۔ ایک دو بچے پیدا کر ڈالے گا۔ آخری عمر میں اللہ اللہ کرے گا ـــــــ اور مر جائے گا! تم سمجھتے ہو کہ انسان کی زندگی میں اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے۔ کہ انسان کی نفسیاتی زندگی کا دستور العمل نہ کبھی مرتب ہوا نہ ہو سکتا ہے۔ انتشار اور اختلال ہی اس کی ترتیب و ترکیب ہے ـــــــ یہ تصویر ایسی نہیں۔ کہ اس کو کسی چوکھٹے میں لگایا جا سکے۔ وہ چوکھٹے اور فریم میں سماتی ہی نہیں۔ سب کی دنیا ایک نہیں۔ جتنے انسان ہیں۔ اتنی ہی دنیائیں ہیں۔ ہر انسان بجائے خود ایک دنیا ہے۔ وہ اپنی دنیا اپنے دل و دماغ میں لیے پھرتا ہے ـــــــ پیدائش اور موت کے سوا دو انسانوں میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ اور یہ دو چیزیں جو مشترک ہیں۔ نہایت خفیف اور معمولی ہیں ـــــــ جس طرح کتاب کے

شروع اور آخر کا سادہ ورق شمار میں آتا ہے ۔ پڑھا نہیں جاتا! زندگی کے ان دو
معمولی حادثوں سے قطع نظر کر لو تو پھر کوئی انسان کسی حیثیت سے دوسرے انسان
کا شریک یا مثل نہیں ہوتا —— البتہ —— میں نے کہا —— جذبہ —
یعنی شہوت ۔ محبت ۔ غصہ ۔ رنج وغیرہ ۔ اس جنس کا ایک مشترک عنصر کہا جا سکتا
ہے ۔ لیکن اس کی کارفرمائیوں اور مظاہروں کو دیکھو تو وہ بھی بالکل الگ الگ
ہیں! ہر وجدان اور کیفیت جدا جدا ہے —— "کیف" اور "طلب"
مختلف ہے ۔ جب یہ حال ہے تو انسان کی زندگی کا کوئی مشترک دستور العمل
کیونکر مرتب کر سکتے ہو ۔ لوگ سوانح عمریاں لکھتے ہیں ۔ تذکرے لکھتے ہیں ۔ سو دو سو
چار سو صفحوں میں گویا ایک انسان کی زندگی کا بہت سا حال لکھ جاتے ہیں ——
تاریخوں کے چند سو یا چند ہزار صفحات پر قوموں اور انسانوں کی بڑی بڑی
داستانیں بیان کی جاتی ہیں —— گویا چھاپہ خانہ کی سیاہی اور کاغذی کے کاغذ
—— سے عہد ماضی کی تاریکیوں میں چراغ روشن کر رہے ہیں! مگر
میں نے کہا —— اختر، کیا حقیقت ہے ۔ ان سوانح عمریوں، تاریخوں
—— اور تذکروں کی! لفافے کے ظاہری نقش و نگار بیان کیے جاتے ہیں!
لیکن لفافہ کے اندر نفسیاتِ انسانی کی جو تجلیات بے قرار رہتی ہیں ۔ اِن تک
سوانح نگار اور مورخ کا قلم اور خیال کبھی نہیں پہنچ جاتا! —— کسی ایک
فرد واحد کی معنوی زندگی کے ہجوم میں گھس کر اس کے خصائص کو ایک ایک
کر کے میدان میں لانا چاہو تو کیا لا سکو گے؟ خود اپنے اوپر یا مجھ پر تجربہ کر کے دیکھو
یا فرض کرو زید کی معنوی زندگی کے کچھ نقوش قلم بند کرنا چاہتے ہو ۔ اِس کی ہر

خصوصیت کے لئے ایک ایک باب مخصوص کر دو۔

زید جب وہ جھوٹ بولتا ہے

زید جب وہ شراب پیتا ہے

زید جب وہ نماز پڑھتا ہے

زید جب وہ چوری کرتا ہے

زید جب وہ عورت کے قریب ہوتا ہے

زید جب وہ دوستوں سے ملتا ہے۔

وغیرہ۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ وغیرہ،

اس میں صرف ایک ہی جزو کو لے لو یعنی "زید جب وہ جھوٹ بولتا ہے" ــــ قلم میں کچھ زور ہے اور زید کے متعلق کچھ بصیرت بھی ہے تو حقیقتِ حال لکھنا شروع کر دو۔ کتنے جھوٹ زید نے بولے۔ کہاں کہاں، کس کس سے، اور کیوں کتنے جھوٹ زید نے ایسے بولے۔ جس سے دوسرے لوگوں کو شدید نقصانات پہنچے، کتنے ایسے بولے جن کا منشا اپنی عیب پوشی تھی، کتنے بے وجہ عادتاً بولے کتنے عورت پر قبضہ کرنے کے اور کتنے اپنی بیوی کو دھوکا دینے کے لئے اور کتنے اپنی اولاد کو بہکانے کے لئے؟ ہر دفعہ جھوٹ بولتے وقت زید کے محسوسات کیا تھے، جذبات کیا تھے، کتنی دفعہ وہ جھوٹ بول کر پشیمان ہوا۔ اس کے کتنے جھوٹ کامیاب رہے، کتنے ناکام ــــ وغیرہ وغیرہ

ساری عمر اس ایک ہی باب کے لکھنے میں ختم ہو جائے گی۔ اس مختصر انتشار کا جس کو انسان کہتے ہیں، دستور العمل کیا بنا سکتے ہو؟ دلی کا فیلسوف شیلو خوب

کہہ گیا ہے ؂

ہے آدمی بجائے خود ایک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

اس محشرِ خیال میں تم جیسے غوطے کھاتے ہیں۔ اور جو اس انتشار کے متعلق کچھ بصیرت رکھتے ہیں ـــــ میری طرح ـــــــــ وہ ہنستے بولتے گذر جاتے ہیں! میں دوسروں کی "انجمن" کے تلاش کرنے میں کیوں اپنی جان کو گھلاؤں؟ ـــــ میری اپنی خلوت میری اپنی انجمن ہے! ہر انسان اپنے ساتھ ایک ایسی انجمن لئے پھرتا ہے ـــــــــــــ کون اس کی سوانح عمری لکھ سکے، کون اس کی معنوی زندگی کا لاکھواں حصّہ بھی بیان کرسکے؟ سب کو اپنی اپنی راہ جانے دو، تم بھی بڑھے جاؤ ـــــ البتہ اتنا کام کیجیو کہ اگر راستہ میں کوئی حسین عورت نظر آجائے تو اس کو سمجھا دینا کہ ان کا (یعنی میرا) گھر اس طرف ہے!! بات یہ ہے کہ میرے "انوارِ محبت" جن کی عامل فی الحال پرسوں رات والی ہے۔ عنقریب کسی اور طرف منتقل ہونا چاہیں گے ـــ اختر ہنستا ہوا اور کہتا ہوا چلا گیا ـــ ٹھہر جا! تو اور تیرا "نورِ محبت" لاتا ہوں بلا کے مولانا خیر الزماں صاحب کو ـــــ

---

۱۴ اگست ۱۹۲۹ء

"گناہ کر، لکھا پاپی بن جا، رات دن کا فرق بھول جا اور سر کوستی سے

بھاری کر کے خانۂ خدا میں لڑکھڑاتا ہوا جا ـــــــــــ
بھوکے کتے کو اپنے دروازہ سے لات مار کر بھگا دے اور لمبی لمبی ڈکاریں
لے کر نرم بستر پر سو جا! ـــــــ
ایک روسی شاعر کی نظم کا یہ ترجمہ میں رات بیٹھا پڑھ رہا تھا - اِس کم بخت
نے اِس قدر خوشگوار نظم کے آغاز کا انجام وطن پرستی کے جذبہ کو قرار دیا
ہے - اِس نے انسانی زندگی کے کیف تمام کی ایسی اچھی تصویر کھینچنی شروع
کی! سارے خطوط صحیح اور متناسب ـــــ مگر آخر میں آسمان سے گرا - سیدھا
وطن پرستی کے چہ بچہ میں! لاحول ولا! میرے اُستاد نے ایک دن خوب کہا تھا -
ـــــ مر گئے بچارے! اِس لئے کہ خوب کہنے والے اکثر مر جاتے ہیں ـــــ
ـــــ خوب کہا تھا انہوں نے! کہنے لگے کہ ان تمام مذاہب کے پیرو
اور علمبردار جو توحید کے مدعی اور شرک کے دشمن کہے جاتے ہیں ـــ خود
بدترین قسم کے بت پرست ہیں - کعبہ کے بتوں کو تو انہوں نے گرا دیا سومنات
کے بتوں کو بھی توڑ ڈالا - مگر ان مٹی اور پتھر کے مجسموں سے زیادہ خونخوار بتوں
کی پوجا شروع کر دی! اُن ہی میں سے ایک وطن پرستی کا لباس پہنا کر نچاتا ہے
جن چیزوں کو اس نے اپنے اخلاقی دستور العمل میں بُرا اور معیوب قرار دیا ہے -
(میں تو خیر اِس دستور العمل کا قائل ہی نہیں) ان سب کو وطن پرستی کے پردہ
میں روا رکھتا ہے - میں جو کام کرتا ہوں ـــــــ کارہائے خلوت ـــــــ
وہی سب بلکہ ان سے زیادہ وطن پرست کرتا ہے - مگر اپنی وطن پرستی کا نام لے کر
میں عیاشی کرتا ہوں - مگر زمین کے قبضہ اور ملکیت کے لئے کسی کا گلا نہیں کاٹتا

وہ ایک گز زمین کے لئے فوجوں کی صفیں آراستہ کر کے ہزاروں لاکھوں انسانوں
کو بھیڑ بکری کی طرح کاٹ ڈالتا ہے اور کٹوا دیتا ہے۔ میں عورت بازی کرتا ہوں
——— بغیر شرماتے اور چھپائے ہوئے ——— وہ
بہانہ بازیاں کر کے، مکر اور فریب سے عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کرتا ہے۔
پھر اپنے کو دنیا کا محسن اور محافظ قرار دیتا ہے۔ میں زنا کرتا ہوں اس عورت
کے ساتھ جو میرا پیسہ لے کر، یا بغیر اس کے مجھے ایسا کرنے کی اجازت دیتی
ہے۔ مگر وہ دوسری قوموں کے گھروں پر بغیر اُن کی اجازت کے قبضہ کر
لیتا ہے اور پھر مفتوح۔ اگر اس کو ڈاکو کہے تو بغاوت کا مقدمہ چلاتا ہے۔
میں شراب پی کر اپنے یار کو پیار کرتا ہوں۔ وہ سپاہیوں کو شراب پلا کر
درندہ بناتا ہے ——— اس کے عیش کے دن میری عیش کی راتوں سے بہت
مختلف ہیں! زندہ باد وطن! پائندہ باد وطن!!

میری تو کبھی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ دنیا کے لوگ کیونکر اُن پُر فریب اصطلاحوں
سے دھوکہ کھاتے ہیں۔ جہاں ایک حسین عورت پاس ہو۔ ایک صراحی شراب کی
سامنے ہو ——— وہیں میرا وطن ہے۔ مگر وطن پرست کا وطن وہ ہے۔
جس کے لئے وہ دوسروں کی عورتوں اور دوسروں کی شرابوں کو چھین لائے!

میں روزانہ ایک دو اخبار پڑھ لیتا ہوں۔ لیکن طلاق کے مقدمات کی
روئدادیں پڑھتا ہوں۔ سینما اور تھیٹر کے اشتہارات پڑھتا ہوں۔ حسن و عشق
کا کوئی قصہ ہو تو وہ پڑھتا ہوں۔ مگر جب اس مطالعے کے سلسلے میں کوئی سرخی نظر
سے گزرتی ہے جیسے:-

"جاپان میں وبا"

"امریکہ میں سونے کے ذخائر کی کمی"

"رومانیہ میں بغاوت"

"اسپین میں دستوری حکومت"

"فرانس کی مجلس وزراء کا استعفا"

تو صرف سُرخی پڑھ کر گذر جاتا ہوں، کبھی ان لغویات میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا! اگر فرانس کی وزارت نے استعفے دے دیا یا اگر رومانیہ میں بغاوت ہو گئی یا اگر امریکہ میں سونے کے ذخائر کی مقدار کم ہو گئی تو میں نے کیا قصور کیا ہے کہ میں اس آدھے یا سوا کالم کے پڑھنے میں اپنا وقت ضائع کرنے پر مجبور کیا جاؤں اگر "لیلے" کے ہم جنسوں نے اپنے پیشہ سے استعفے نہیں دیا" تو مجھے کیا پروا ہے اگر سارے یورپ کے وزرائے اعظم استعفے دے دیں۔ اگر وہسکی کے کارخانوں میں کافی وہسکی تیار ہو رہی ہے تو پھر امریکہ میں سونے کی مقدار کے کم ہو جانے سے مجھے کیا غرض؟ اگر ہندوستان میں کوئی ایسی بیماری نہیں ہے۔ جس کے جراثیم کا زہر قاطع باہ ہو تو پھر جاپان کی وبا کے حالات پڑھ پڑھ کر میں کیوں ماتم کرنے لگوں؟ —— دنیا کے سارے وطن پرستوں کو میرے مقابلہ میں لے آؤ سب کو ہارنا پڑیگا! —— میری دلیل بہت قوی ہے —— لاجواب ہے بڑے بڑے منطقی دوستوں کی زبان بند کر دیتا ہوں۔ وہ آخری حجت ہے —— عورت اور مینائے مے!! دیسی ہو بدیسی مجھے تو وطن پرستی، قوم پرستی، تہذیب تمدن اور اسی قسم کی تمام بیماریوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ عورت اور مینائے مے!!

بیوقوف روسی شاعر کا قلم میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں یوں اسکی نظم کو ختم کرتا:۔

گناہ کر، پی جا، رات دن کا فرق بھول جا —— بھوکے کتّے کو اپنے دروازے سے لات مار کر بھگا دے اور لمبی لمبی ڈکاریں لے کر نرم بستر پر سو جا —— آج اگر روس کی زمین پر امریکہ کا جھنڈا نصب ہو جائے تو ووڈکا کے بجائے بیئر پینی شروع کر دے اور اگر انگلستان کا قبضہ ہو جائے تو وسکی پی۔ فرانس پر قابض ہو جائے تو انگوری پی اور اگر مہاتما گاندھی کا چرخہ چلنے لگے تو سیدھی پی، ٹھرا پی —— اور یاد رکھ —— اخبار کبھی نہ پڑھ"!

---

۱۶ اگست ۱۹۲۹ء

لاکھوں برس پہلے، جب ہنوز انسان جنگلوں میں ننگا پھرتا تھا —— کیا اچھے تھے وہ دن —— جب وہ درختوں پر اور غاروں میں زندگی بسر کرتا تھا۔ ایک دن اس کی صحرائی آبادی میں ایک انسان درخت کی بلند شاخ سے نیچے کیچڑ میں گر پڑا۔ اس کے دوسرے ساتھی دوسری شاخوں پر جھول رہے تھے۔ اس کو کیچڑ میں سنا ہوا دیکھ کر خوب ہنسے۔ ان میں سے ایک ہنستے ہنستے بے قابو ہو کر خود بھی اسی طرح کیچڑ میں گرا۔ ہنسنا بھول گیا۔ چوٹ بھی لگی۔ کیچڑ میں لت پت ہو گیا۔ منہ پھلائے ہوئے اٹھا اور صحرائی

چشمہ کی طرف چل دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ چشمہ کے پانی سے اپنا بدن صاف کرے مگر کنارہ پہنچ کر اس چشمہ کے شفاف پانی میں دفعتہً اس کو اپنا عکس نظر آیا۔۔۔۔ کیچڑ میں لت پت، منہ سا سُوجا، ہاتھ پاؤں لتھڑے ہوئے ناک پر مٹی کا ایک تودا چپکا ہوا۔۔۔۔ ہیئت کذائی نہایت تمسخر انگیز۔۔۔۔ وہ پانی پر اپنے اس عکس کو دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑا۔ باوجود چوٹ کی تکلیف کے اس کو اپنے حال پر ہنسی آگئی۔

اس وقت پہلی دفعہ انسان نے جرأت مردانہ کی بہترین مثال پیش کی۔۔۔۔ یہ جرأت کہ اپنی چوٹ اور اپنے دکھ پر ہنس دے!! آج بھی لاکھوں برس بعد وہی انسان مرد ہے جو تکلیف دہ چیزوں کے تمسخر انگیز پہلو بھی دیکھ سکے۔ اپنی مصیبتوں میں تبسم آفریں جزیات کا پتہ پا سکے۔ اپنی تکلیف میں مسکرانے کا موقع نکال لے!!۔۔۔۔ یہ قصہ مجھے اس لئے یاد آیا کہ اختر نے آج صبح معترضانہ کہا تھا کہ تم سنجیدہ نہیں ہوتے اور موقع بے موقع ہی ہی ہا ہا کرتے رہتے ہو۔ واقعہ یہ ہوا کہ میاں اختر اپنی ایک معشوقہ کے مکان پر تشریف لے گئے۔ اس کے دروازے کے قریب ہی سامنے سے اپنے چچا میاں کو آتے دیکھ کر ایسے گھبرائے کہ دروازے میں گھس گئے۔ وہاں تھا اندھیرا اور راستہ میں پڑا تھا ایک تختہ، ٹھوکر کھا کر گرے تو ناک پر چوٹ آئی۔ جھنجھلاتے ہوئے اندر پہنچے تو مسماۃ کسی دوسرے چاہنے والے کے ساتھ تخلیہ فرما رہی تھیں۔ جلے بھنے میرے پاس آئے، میں نے شروع کیا مذاق! بالکل آگ ہو گئے۔۔۔۔ اصل یہ ہے کہ اپنی حماقت کے تکلیف دہ نتائج پر خود ہی ہنسنا بہت مشکل

کام ہے اور جو لوگ ایسا کر سکتے ہیں۔ ان کی اخلاقی سطح درحقیقت بہت بلند ہوتی ہے ـــــ میاں اختر! سچ کہتے ہیں!

۱۹ر اگست ۱۹۲۹ء

ـــــ خانہ بدوش ـــــ آوارہ گرد ـــــ

وہ سب ہیں۔ جو انسان اور آدمی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں ایک ویرانہ ہے یہ دُنیا۔ زندگی ایک لمبی سڑک ہے جو نہ معلوم کہاں سے شروع ہوتی اور کہاں ختم ہوتی ہے۔ ایک انبوہ کثیر ہے جس میں ہم سب ایک دوسرے کو دھکے دیتے کہنیاں مارتے، کچلتے، روندتے گرتے پڑتے، دوڑتے اور لنگڑاتے چلے جا رہے ہیں، خراب و خستہ ـــــ اس کا نام زندگی ہے! کسی ستم ظریف خالق نے ہمیں اپنا کھلونا بنایا ہے ـــــ گدھے بناتے ہیں اور ان سے کھیل رہا ہے کسی کا کان اینٹھ دیا، کسی کی ٹانگ توڑ دی، کسی کی دم کھینچ لی، کسی پر پتھر اور کسی پر جواہرات لاد دیئے کسی انتا کھلا دیا کہ اس کا پیٹ پھٹ گیا اور کسی فاقہ زدہ کے منہ کا نوالہ بھی چھین لیا ـــــ یہ سب گدھے دوڑے دوڑے پھر رہے ہیں ـــــ کدھر ہے؟ کہاں ہے؟ کون ہے؟ کوئی مسجد کے مینارے پر چڑھ کر پکارنے لگا۔ کسی نے مندر میں گھنٹے بجانے شروع کر دیئے، کوئی کتابوں کے ورق اُلٹنے لگا ـــــ بحثیں چھڑ گئیں، یہ نہیں وہ ہے وہ نہیں یہ ہے! خدا ایسا ہوتا ہے ـــــ ایسا نہیں

ہوتا۔ بیچ میں کوئی صاحب بول اُٹھے ہوتا بھی ہے؟ ہے بھی؟ پھر سب طرف سے بھونک شروع ہو گئی، پنجوں اور دانتوں سے لڑنے لگے گلے کی رگیں پھول گئیں، منہ سے کف گرنے لگا۔ گوشتِ خمِ دندانِ سگ!! نتیجہ؟ نتیجہ سب یکساں ——— یوں ہی لڑتے لڑتے مر گئے ——— اور مرنے کے بعد؟ کسی نے کہا جنت اور حوریں، شہد کی نہریں اور دودھ بھرا حوض کسی نے کہا۔ شکتی اور مکتی، کسی نے کہا آواگون ——— معلوم کسی بے وقوف کو کچھ نہیں! اللہ اللہ کرنے والے بھی گئے، رام رام کرنے والے بھی مرے، خاک میں دبائے گئے یا آگ میں جلائے گئے ——— باقی کوئی نہ بچا اور اللہ اگر کوئی ہے تو وہ وہیں کا وہیں رہا جہاں تھا، مرتے رہو، مٹتے رہو، روتے رہو، بسورتے رہو ——— مختار نہیں ہو، مجبور ہو، اِس ساری زندگی میں جو موت سے زیادہ غمناک اور دوزخ کی آگ سے زیادہ جلانے والی ہے شعریت اور پیار کا کوئی پہلو ہے تو وہ صرف عورت ہے اور اِس کے لئے مرد کی "طلب"! مگر قیامت کہ روشنی کی اس ذرا سی شعاع کو بھی مذہب والے مٹائے ڈالتے ہیں، آنکھیں نیچی رکھو، تاکو مت۔ آنکھ سے آنکھ نہ ملاؤ۔ ہاتھ سے ہاتھ مس نہ کرو! پھر یہ دھمکیاں کہ ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں گے ——— آنکھیں پھوڑ دی جائینگی۔ دوزخ کے سرخ دہکتے ہوئے انگارے حلق میں ٹھونسے جائیں گے۔ ستر ہزار برس مبتلائے عذاب رکھے جاؤ گے۔ ستر ہزار کوڑے مارے جائینگے۔ ستر ہزار سانپ تمہارے جسم سے لپٹیں گے۔ ستر ہزار بچھو تمہارے ڈنک ماریںگے ——— تنگ آ گیا ہوں۔ اِس تمام جبر و قہر سے۔ میں اِس

ذلیل محکومیت اور جابرانہ تخویف سے اپنی آزادی کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں، للکار کر
کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی کا محکوم نہیں ہوں۔ صرف حسنِ ازل کا غلام ہوں اور اگر
خدا بھی حسنِ ازل ہے تو مجھے اس کی خدائی سے انکار نہیں۔ مگر یہ نہ ہوگا کہ
جبر و قہر اور تخویف و تعزیر میری فطرت کے تقاضوں کو دبا سکے۔ حسن کی غلامی
عین آزادی ہے۔ جس طرح ایک قطرہ پیالہ میں مقید اور دریا میں آزاد ہوتا ہے
اسی طرح میرا وجود مذہب کے پیالے میں بند رہنا قبول نہیں کرتا۔ وہ بہتے
دریا میں آزاد رہنا چاہتا ہے

کس کو سمجھاؤں کس کو بتاؤں؟ تمام دنیا کے بیوقوف
خدا کو حسن و مہر کے بجائے جبر و قہر کے لباس میں دیکھتے ہیں۔ اس کو ازلی اور
ابدی کہتے ہیں۔ مگر حسن کو ازلی اور ابدی نہیں کہتے

کھوپڑیاں الٹی چپکائی گئی ہیں!!

---

۲۵ اگست ۱۹۲۹ء

رات صحن چمن میں حبس تھا اور گرمی کی شدت نے مجھے
اور اس کو بوکھلا دیا تھا۔ ہوا نام کو نہ تھی۔ وہ مخمور تھی اور میں مست۔ اس نے
کہا لبِ بام چلو۔ وہاں کچھ رمق ہوگی۔ چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ میں اس کو گود میں
اٹھا کر زینہ پر سے چلا۔ اس کا جسم میرے بازوؤں پہ رکھا ہوا تھا۔ اور اس کی
صندلی بانہیں میری گردن میں لپٹی ہوئی تھیں۔ پہلے زینہ پر میں اس کو لے کر

ایک سانس میں چڑھا۔ جیسے کڑی کمان کا تیر! وہ میرے آغوش میں آنکھیں بند کئے ہوئے قدم بقدم بلند ہونے کا مزا لوٹ رہی تھی ——— پہلے زینہ کو ختم کر کے میں نے ایک لمحہ توقف کیا کہ ذرا اپنے آغوش کی گرفت کو درست کر لوں۔ پھر میں دوسرے زینہ پر چڑھا۔ رفتار ذرا سُست تھی۔ مگر کیف باقی تھا۔ ہوا کے دو چار معطر جھونکے بھی فروغِ مے سے تمتماتے ہوئے چہرہ پر بہت خوشگوار معلوم ہوتے۔ میں نے یہ زینہ بھی ختم کر لیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ میرے گلے کو آہستہ آہستہ پیار کر رہے تھے۔

میں نے پھر اس کو اپنے آغوش میں سنبھالا۔ ذرا دم لیا، تیسری منزل دُور نہ تھی۔ مگر جی چاہتا تھا کہ دوسری ہی منزل پر ٹھہر جائیں۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ "لو تھک گیا" دل نے کہا، میں نے پھر ہمت کی اور اُس کو گود میں سمیٹ کر تیسری منزل کے زینہ پر چڑھنے لگا۔ اس کو کچھ خبر نہ تھی۔ مگر میرے لئے اس تیسری منزل کا ہر قدم کس قدر گراں اور مشکل ہو گیا تھا۔ پسینہ آ گیا۔ ان چند سیڑھیوں میں ہر سیڑھی ایک کڑی منزل تھی۔ سانس کا سلسلہ تیز ہو گیا۔ ہر دو قدم کے بعد دو منٹ دم لینے لگا ——— اس کو اب بھی کچھ خبر نہ تھی۔ کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے ——— میں ہانپ رہا تھا ——— ایک سیڑھی پر بیٹھ کر ذرا سستا لوں، یا اُس کو گود سے اُتار دوں ——— اندر سے آواز آئی ——— ایسا نہ کیجیو وہ سمجھے گی تم تھک گئے ——— مردوں کی تھکن کتنی ہی ہو پر عورت اُس کو نہ سمجھے! ——— مردانہ نخوت نے سہارا دیا۔ باقی سیڑھیاں کسی نہ کسی طرح طے کیں۔ صحن بام پر پہنچ کر میں نے کہا "لو اب گود سے اُتر دو۔ اُس نے

اپنی نیم ہوشیار آنکھیں کھولیں ـــــــ "بس آگئے؟" پہنچ گئے ـــــــ
ـــــــ ایک منزل اور ہوتی تو میں اس طرح تمہاری گود میں سوار رہتی" اِس
"بس" کی بلاغت نے مجھے شرما دیا۔ میں نے کہا "اب اگلی منزل اور تو کوئی نہیں
آسمان ہے، کہو تو اُدھر کا رُخ کردوں؟ ـــــــ
دل کہہ رہا تھا، کب گود سے اُتریں گی ـــــــ تیسری منزل
کے کھلے ہوئے صحن میں ایک نرم قالین پر میں نے اس کو اپنی گود سے اس طرح
لوٹ دیا ـــــــ بکھیر دیا ـــــــ جس طرح دامن سے پھولوں کو! میں
پسینہ میں نہا رہا تھا۔ ہانپ رہا تھا، کمر میری کمان ہو رہی تھی۔ مگر وہ میرے
آغوش کی گرمی سے مست و مخمور تھی، اس کا دل اس طرح میرے دل کے پاس
دھڑک رہا تھا! جس طرح عورت کا دل مرد کے آغوش میں دھڑکتا ہے!
کسقدر مختلف تھی۔ میری اور اُس کی حالت! وہ سرورِ عیش میں غرق ہیں تھکا ہوا!
گویا وہ کہتی تھی بس نہیں ـــــــ اور ـــــــ اور میں شرماتا
جاتا تھا! ـــــــ اسی کا نام بڑھاپا ہے ـــــــ شباب
کے روانہ ہونے والے قافلہ کی پہلی گھنٹی! جب آدمی پھولوں کی ایک گٹھڑی کو
لیکر تین منزل بھی نہ چڑھ سکے تو سمجھیے کہ "رستم خانی" ختم ہوئی ـــــــ
اپنے اس انحطاط کو ہر مرد، عورت سے چھپاتا ہے۔ مگر کب تک؟ وہ تھک
جاتا ہے، اس کے بوسے بھی تھک جاتے ہیں، اس کے آغوش کی گرفت
بھی تھک جاتی ہے اور کوئی اُس کے کان میں کہتا ہے:-

اُٹھئے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی

ـــــ + ـــــ

۵ ستمبر ۱۹۲۹ء

میاں اختر کے ایک دوست نے کل کسی وجہ سے خودکشی
کرلی، اختر بہت مغموم آیا۔ کہنے لگا۔ خودکشی دیوانگی ہے یا بے اختیاری و
بزدلی، میں نے کہا، ان میں سے کوئی بات بھی خودکشی کے فلسفہ کی تشریح نہیں
کرتی اگر مان بھی لیا جائے کہ خودکشی دیوانگی کا ایک مظاہرہ ہے۔ تو بھی یقیناً
وہ ایک بڑا کام ہے ——— ہر بڑا کام دیوانگی کی حالت میں انجام پاتا ہے
کوئی بڑا کام بغیر دیوانگی کے انجام نہیں پاتا۔ اگر دیوانگی ہی کو خودکشی کا سبب
مان لیا جائے تو بلاشبہ وہی سبب اس فعل کے ارادہ کی بلندی کا ثبوت
ہے بے اختیاری اور دیوانگی بغیر مجبور اور انسان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔
اب رہی بزدلی تو خودکشی کے فلسفہ میں تو بزدلی کو کوئی دخل ہی نہیں ———
دوسروں کی جان لینا اکثر بزدلانہ جذبات پر مبنی ہو سکتا ہے مگر خود اپنی جان لینا
یا دینا بہادری عالی حوصلگی خود مختاری اور آزادی کا سب سے بڑا مظاہرہ ہے
اس فعل کی معنوی حیثیت پر غور کرو۔ تو مذہب اور اخلاق کے فیصلے اور فتوے
بالکل لغو اور بے معنی معلوم ہوتے ہیں۔ انسان کی زندگی کا سب سے اعلٰے
تخیل آزادی کا تخیل ہے ——————————— عمل
ضمیر اور ایمان کی آزادی، جس پر مذہب قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔ خدا
اور اس کی شان جبر و قہر کے تخیل نے آزادی کی معنویت کو فنا کر ڈالا ہے
گویا انسان ایک ابلہ بندہ ہے ——— لاچار اور مجبور ——— اپاہج اور

کوڑھی ـــــ جس کی ناک میں ایک مضبوط نکیل پڑی ہوئی ہے - اور یہ بیل اس نکیل کی رسّی کے ذریعے سے کھینچا جاتا ہے - دوڑایا جاتا ہے گھسیٹا جاتا ہے، باندھا جاتا ہے ـــــ وہ خود اپنی مرضی سے نہ ایک قدم اٹھا سکتا ہے، نہ بغیر اجازت آنکھ کھول سکتا ہے - نہ ایک لمحہ سوچ سکتا ہے - پھر جب ان بیلوں میں سے کوئی ایک ناک کو نکیل سے نکال کر رسی کے پھندے توڑ ڈالتا ہے - اور آزاد ہونے کا دعوےٰ کرتا ہے تو مرتد کہا جاتا ہے - کافر کہلاتا ہے، مردود وملعون کے نام سے یاد کیا جاتا ہے! میں نے اختر کو ایک مشہور روسی مصنّف کے چند فقرے سنائے - جو وہ اپنے ہیرو کی زبان سے ادا کراتا ہے! یہ ہیرو خودکشی کرنے کے متعلق اپنے ارادہ پر انسان کی خودمختاری اور آزادی کے فلسفہ کو دلیل لاتا ہے اور کہتا ہے :-

"مجھے تعجب ہوتا ہے کہ سب لوگ کیونکر بلا تامل جیتے رہتے ہیں ـــــ اس غلامی کی حالت میں ـــــ کیا اس دنیا میں ایک بھی ایسا مرد نہیں، جو اپنی شخصی آزادی کا معتقد ہو کر اپنی ہستی کے نحیف سے نازک معاملے میں خودمختاری جتانے کی ہمّت کر سکے ـــــ میں اپنی خودمختاری ثابت کرنا چاہتا ہوں - میں اسے ثابت کروں گا - چاہے مجھے ایک بھی پیرو اور شریک کار نہ ملے! ـــــ مجھ پر لازم ہے کہ اپنے کو گولی مار لوں کیونکہ اپنے ہاتھوں سے فنا ہونا خودمختاری کی انتہا ہے! ـــــ

اختر اپنے دوست کے غم میں اور اس غم سے زیادہ اپنی دیرینہ توہم پرستی میں مبتلا تھا، وہ میرے اس نکتہ کو سمجھتا تو کیا - شاید اس نے سنا بھی نہیں -

کہنے لگا۔ اب اس بحث سے فائدہ کہ مرحوم کا فعل اچھا تھا یا برا؟ مجھے تو اپنے دوست کی جدائی کا غم بے حال کئے دیتا ہے!! میں نے کہا اختر! غم کی حقیقت بہت ناقابلِ اعتنا ہے۔ وہ محض ایک اصطلاح ہے ــــــ بے معنی ــــــ ایک نہایت عارضی کیفیت ہے، جو کمزور دل و دماغ پر طاری ہوتی ہے۔ دل و دماغ جس قدر کمزور ہوتا ہے۔ اسی قدر زیادہ یہ کیفیت طاری ہوتی ہے۔ کوئی غم باقی نہیں رہتا۔ اگر ہر شخص اپنی عمر کے مغموم کرنے والے واقعات کا حساب لگائے تو ابتدا سے انتہا تک اس کو اپنی زندگی کے سینکڑوں ہزاروں واقعات ایسے یاد آئیں گے جو اس کے انتہائی غم و الم کا باعث ہوتے تھے اور جن میں سے ہر غم ایسا تھا کہ وہ اس کو جانگداز سمجھتا تھا۔ لیکن غم گذر گیا اور جان موجود ہے مثلاً جب اکلوتا بیٹا مرا تو اس نے دیواروں سے اپنا سر ٹکرایا۔ وہ ہفتوں نہینوں برسوں مبہوت اور بے حال رہا۔ برسوں اُس کے آنسو خشک نہ ہوئے۔ وہ قبر پہ مجاور بن کر بیٹھا وہ تمام لذاتِ دنیا سے دست کش ہو گیا۔ اس کو یقین تھا کہ وہ اسی غم میں گھل گھل کر مر جائے گا ــــــ مگر ــــــ

ہوا کیا؟ ہوا یہ کہ چند روز بعد وہی انسان ہے۔ وہی دیواریں ہیں۔ وہی خشک آنکھیں ہیں۔ وہی دنیا کی لذتیں ہیں! بیٹے کی قبر پہ نہ اب چراغ ہے نہ پھول ہیں! غمگین باپ اب غمگین نہیں، اُس کو رفع غم کے بہت سے ذرائع مل گئے۔

ــــــ اب اس کی زندگی کا وہ حادثہ ایسا ہے۔ جیسے کسی نے بہتے دریا کے ساحل پہ کھڑے ہو کر ایک سنگریزہ پانی پر پھینکا۔ اس سنگریزے کے گرنے کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر تک پانی کی سطح پر گول دائرے بنتے رہے!

اس کے بعد پانی کی سطح پھر ہموار ہو گئی —— دریا کا بہاؤ ایک لمحہ
کے لئے بھی نہ رک سکا —— میں نے اختر سے کہا کہ تم پہلے اپنے ہی
باپ کا حال دیکھ لو۔ جب تمہاری ماں ان کی چہیتی بیوی مری تھیں۔ تو دو برس
تک وہ کس طرح زمین پر لوٹا کرتے تھے اور تم لوگ سمجھتے تھے۔ کہ وہ پاگل ہو
کر اسی حال میں مر جائیں گے —— لیکن ہوا کیا؟
دریا کی وہ موج گذر گئی۔ ہمارے چچا صاحب قبلہ نے ۶۵ سال کی عمر
میں دوسرا بیاہ رچایا۔ اولاد پیدا کیا، داڑھی پر خضاب لگانے لگے۔ بچوں
کو گود میں لئے شاداں و فرحاں، ہنستے مسکراتے پھرا کرتے ہیں۔ کوئی کہہ سکتا
ہے کہ یہ بڑے میاں وہی ہیں جو دس برس پہلے دیوانوں کی طرح قبرستان کی
قبروں سے سر ٹکراتے پھرتے تھے۔ اس عارضی اور نقش بر آب کیفیت کو ——
میں نے کہا —— آدمی پیدا ہی کیوں ہونے دے وہ تکلیف جو چند روز
بعد یقیناً رفع ہو جانے والی ہے چند روز بھی کیوں ہم پر مسلط رہے۔ اس
کیفیت کو ہم پیدا ہی کیوں ہونے دیں۔ میری خود تو یہ حالت ہے کہ میرا کوئی
عزیز دوست یا معشوق مر جائے تو میرا توحش اور تردد بمشکل اس وقت
تک باقی رہے گا۔ جب تک اس کے کفن و دفن سے فراغت حاصل
ہو۔ اس کے بعد جو چیز گذر گئی اس کو یاد رکھ کر اپنے قلب کو چند
روز بھی افسردہ رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ سچ ہے کہ مجھے
اس انسانی کمزوری کو رفع کرنے کی ——
—— جس کو غم کہتے ہیں —— تھوڑی سی کوشش

ضرور کرنی پڑے گی ۔ مگر یقین جانو ۔ میں نے اکثر کامیابی کے ساتھ یہ کوشش کی اور دوسروں کے مقابلہ میں اپنی اس کمزوری کو بہت کچھ رفع کر لیا ہے ۔ اختر کہنے لگا ۔ خدا وہ دن نہ لائے ۔ لیکن اگر کوئی وقت ایسا آیا تو تمہاری غم ربا طاقت کے کرشمے ہم بھی دیکھیں گے ۔ پھر وہ کہنے لگا ۔ تم بھول گئے "لیلےٰ" کے عشق میں تمہارا کیا حال ہوا تھا ۔ میں نے کہا ۔ تو بے وقوف ہے جس کو تو غم سمجھا وہ غم ہی نہ تھا ۔ مستی کا ایک جھونکا تھا ۔ "طلب" کا ایک جذبہ تھا ـــــــ محبت کی شراب بالکل میٹھی ہو تو بے کیف ہو جاتی ہے، اس کے اندر تھوڑی تلخی بھی باقی رہنی چاہیے ۔ عیش کے پجاری اپنی آنکھوں سے جو آنسو گراتے ہیں وہ آنسو خود جزو عیش ہوتے ہیں ـــــ ان آنسوؤں کو اُن آنسوؤں سے کیا علاقہ جو کفنائے دفنائے مردے کے لئے بہائے جائیں ! آنسو بہانے ہوں تو کسی جیتے جاگتے دلربا کے لئے بہاؤ ۔ میں اعتراض کروں تو گناہ گار !

۱۱ر ستمبر ۱۹۲۹ء

حسین عورت کی محبت دل اور دماغ اور جسم کے تمام قوے کو متاثر، ماؤف اور مجبور کر دیتی ہے، اگر معدہ اور آنتیں اپنی آزادی اور خود مختاری اس حال میں بھی قائم رکھتی ہیں! "عشق" کا کتنا ہی شدید حملہ ہو مگر بھوک ضرور لگتی ہے اور نہ بھی لگے تو بھی کھائے بغیر مفر نہیں، تقاضا ہو یا نہ ہو معدہ اور آنتوں کو ان کا اخراج ہر حال میں ادا ہی کرنا ہوتا ہے! عشق کی شہنشاہیت کو آنتیں کسی طرح قبول نہیں کرتیں! جو لوگ اس حقیقت کو یاد رکھتے ہیں وہ حُسن پرستی کی زندگی کو اپنے لئے قدرے آسان بنا لیتے ہیں۔ میرے ایک دوست تھے خدا بخشے ——— ۶½ فٹ کے قریب ان کا قد، جسم کے وزن کا یہ حال کہ معمولی کرسی یا پلنگ اس کا حریف نہ ہو سکے۔ مزاج شاعرانہ طبیعت رندانہ ذات کے ٹھیٹھ پٹھان، متوسط حثیت کے زمیندار، دلّی کی ایک بازاری عورت پر مفتون تھے۔ ان کے عشق کا موسم مقرر تھا۔ زمینداری میں تحصیل وصول کا وقت سال میں دو دفعہ آتا ہے، ایک دفعہ جولائی میں، ایک دفعہ دسمبر میں۔ یہی خان صاحب کی عشق کی تجدید کا زمانہ ہوتا تھا۔ گاؤں سے چار پانچ ہزار روپیہ وصول کیا۔ بجنسہ لوہے کے بکسوں میں بھرا اور سیدھے دلّی آ گئے۔ "عشق" اپنی پوری شدت کے ساتھ شروع ہو گیا۔ بی صاحب بھی خان صاحب سے جوابی التفات کرنے لگیں، دو تین مہینے دن اور رات محفلِ عیش جمی۔ خان صاحب

کا یہ حال کہ ایک لمحہ کے لئے بھی معشوقہ طنار کا آنکھوں سے اوجھل ہونا گوارہ نہیں اسی حالت میں رفتہ رفتہ لوہے کے بکس خالی ہونے لگے۔ آخر کار جس دن ملازم نے دست بستہ عرض کیا کہ سرکار! اب صرف ریل کے کرایہ کے بقدر روپیہ باقی ہے خاں صاحب کے عشق کا سمندر باد پا دوڑتے دوڑتے دفعتاً رکا، سامان بندھنا شروع ہو گیا۔ دو روز بعد خان صاحب رخصت ہو گئے۔ بی صاحبہ اسٹیشن تک ان کو "خدا حافظ" کہنے آئیں۔ خان صاحب وطن کو سدھارے ——— تین چار مہینہ بعد جب خریف کی فصل کا روپیہ وصول ہونے لگا تو عشق کے جراثیم بھی بیدار ہونے لگے اور پھر دلی کے کسی ہوٹل میں حسن و عشق کی وہی آویزش شروع ہو گئی تقریباً ۲۰ برس تک خان صاحب اسی وضع داری کے ساتھ "عشق" کرتے رہے اور ان کی معشوقہ بھی ان کے ساتھ نباہتی رہیں۔ حتیٰ کہ ان ہی کی گود میں ایک دن خان صاحب نے ایسی آنکھیں بند کیں کہ پھر کبھی نہ کھولیں! ——— مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ معدہ پر عشق کا زور نہیں چلتا۔ جسم کا بادشاہ دماغ سمجھا جاتا ہے یا دل مگر دونوں حسن و عشق کے مقابلہ میں اپنی حکومت سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ لیکن معدہ حضرتِ عشق کا حکم کسی طرح نہیں سنتا۔ دونوں وقت پیٹ بھر کر روٹی ملتی رہے۔ تب ہی حسن کا جوہری ان موتیوں کو پرکھ سکتا ہے۔ پیٹ خالی ہو تو چودھویں کا چاند اور آسمان کا تارا اس کی "طلب" کو تسکین نہیں دے سکتا ———

مٹھی بھر آرد گندم اس سب پر بالا ہے!

۱۹ ستمبر ۱۹۲۹ء

بیوقوف، گدھے، عقل کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں۔ سائینس، سائینس، سائنس، سنتے سنتے تھک گیا ہوں! خدا جانے کس طرح بی اے کے درس میں پروفیسر نے یہ بلا میرے دماغ میں ٹھونسی ہوگی، اس دن کے بعد سے آج تک پھر تو میں نے کبھی نام نہیں لیا۔ کہتے ہیں کہ علم کی افزونی انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی کا باعث اور عقل کی ترقی و وسعت اس کی دنیوی زندگی میں راحت کا موجب ہے، لاحول ولا قوۃ، دنیا کو تباہ کیا علم کی افزونی اور عقل کی افزائش نے ہم کو راحت اور سکون قلب سے محروم کیا علوم کی ترقی نے ـــــ انسانوں کے قلوب بھبھور کر ڈالے، زندگی کا سکون واطمینان خاک میں ملا دیا ـــــ سانس لینا مشکل ہو گیا ـــــ علم کی اس ترقی اور عقل کے اس ارتقا کی بدولت! جو کام پہلے مذہب کرتا تھا۔ وہ اب سائنس انجام دیتی ہے، اول تو مذہب نے انسانوں کو انسانوں سے لڑایا! خون کی ندیاں بہائیں۔ مخلوق کو بھوکا مارا، کسی طرح مذہب کا زور ٹوٹا۔ تو اب سائنس کا عفریت میدان میں بل کھاتا ہوا آیا۔ پہلے اللہ اور رسول کا نام لیکر "تہذیب" اور اخلاق کے علم بلند کئے جاتے تھے۔ اور ان علموں کے سایہ میں خون پیا جاتا تھا اور ہڈیاں چبائی جاتی تھیں۔ اب سائنس اور عقل کا دیوتا ہمارے دنیا خون پر چھایا ہوا ہے۔ مفر کی صورت کوئی بھی نہیں! یہ تو سب کہتے ہیں کہ سائنس نے انسان کو بہت فائدہ پہنچایا مگر ثابت کوئی نہیں کرسکتا کہ فائدہ پہنچایا کیا؟ سوال کیجئے

تو کہیں گے، واہ، یہ ریل، یہ تار برقی، یہ بجلی، یہ ٹیلیفون، یہ آلات ہوائی ——— یہ اور یہ اور یہ! ان بے وقوفوں سے پوچھئے کہ جب یہ نعمتیں دنیا میں نہ تھیں۔ تو انسان آج سے بہتر حالت میں زندہ تھا یا نہیں؟ ملنا کہ اس کے سفر لمبے اور تکلیف دہ، اس کے کھانے بے مزہ اور پھیکے، اس کا لباس موٹا اور بھاری تھا۔ مگر اس کی عمر آج کے مقابلہ میں کتنی زیادہ، اس کے قویٰ کسقدر مضبوط اس کا دل کیسا مطمئن تھا! یہ سچ ہے کہ رکابدار ایسے نہ تھے۔ درزی اپنے فن میں اس قدر ہوشیار نہ تھے۔ دھوبی اِسقدر صاف کپڑے بجلی کی مشینوں سے نہ دھو سکتا تھا۔ مگر دل میلے نہ تھے۔ بے چین اور کمزور بھی نہ تھے۔ اُس گذرے ہوئے زمانہ میں جس کو آج کل کے نام نہاد اہل علم "زمانہ جاہلیت" کے نام سے یاد فرماتے ہیں۔ زندگی کے متعلق انسان کے عقائد سیدھے سادے تھے زندگی کا تار اِس قدر اُلجھا ہوا نہ تھا۔ اِسی لئے اس کا معدہ غذا کو اطمینان اور آسودگی کے ساتھ بہ آسانی ہضم کر لیتا تھا۔ آج جبکہ مذہب اور عقائد میں ایک طرف اور دنیوی معاملات میں دوسری طرف بال کی کھال نکالی جا رہی ہے۔ جب کلیسا اور مسجدوں کے ممبروں سے چیخ چیخ کر لمبے لمبے وعظ سنائے جا رہے ہیں۔ جب قوموں کے لیڈر اور ڈکٹیٹر قوم پرستی اور وطن پرستی کے گیت گا رہے ہیں۔ انسان ایک وقت کی روٹی سکون کے ساتھ بیٹھ کر نہیں کھا سکتا۔ "عہدِ جاہلیت" کے مقابلہ میں آج کو کھانے بے انتہا لذیذ ملتے ہیں۔ لیکن وہ کرے کیا، اس کا معدہ اِن لذائذ کا حریف نہیں ہو سکتا! بستر بھی اِس قدر نرم ہیں۔ جیسے کہ پہلے کبھی نہ تھے مگر دماغوں میں خشکی ہے، نیند رات بھر نہیں آتی! زندگی کے دریا

کے کنارے علم و فضل کے بہت اونچے اونچے مینار بنائے جا رہے ہیں مگر یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ دریا کا پانی کس قدر گدلا ہو گیا ہے آب مصفیٰ کے بجائے کیچڑ اور دلدل زیادہ ہے! زندگی کا فلسفہ ہزاروں، لاکھوں کتابوں سے لدی ہوئی الماریوں میں محفوظ ہے لیکن فلسفہ زیادہ اور زندگی کم ہے۔ کوئی دن آئے گا۔ کہ فلسفہ ہی فلسفہ رہ جائے گا۔ اور زندگی نام کو بھی نہ رہے گی۔ آدمی مشین بن کر رہ جائینگے جو ریاضی کے اعداد کی ضرب اور جمع کا حساب لگا لگا کر سانس لیا کرینگے۔ آنکھوں اور کانوں اور ناکوں میں سائنس کے معمل کی نلکیاں ٹھنسی ہوئی ہوں گی۔ عقل پر فلسفہ کا غلاف چڑھا ہوگا! یہ حالت آج بھی کچھ کم نہیں۔ مدرسوں اور علمی اداروں میں کہیں :۔

"دعوئے مفروض کامل"

"مقدم دائمہ"

"اطعقات"

"اولیاتِ عامہ"

"علت مستقیم"

"منافی کامل یا ناقص"

"تعمیمات تجربی"

"مغالطات منافات"

"علتِ قریبہ" اور "علت غیر مستقیم"

"قضیہ سالبہ و موجبہ"

کی بحث جاری ہے اور طلباء گھتے ہوئے ہیں! کہیں

"تفاعیل زائدہی"

"سلسلہ اہتزازی"

"علم مثلث"

"قانون تقسیمی"

"ترکیب و تحلیل"

کے جھگڑے پڑے ہوتے ہیں، پھر اگر ایک طرف

"مابعد الطبیعات"

"روحانیات"

"سرمدیت"

"ہیولیت" اور

"فوق العقلیت"

کی الجھنوں میں طالبانِ علم کی عمریں ضائع ہو رہی ہیں تو دوسری طرف

"مذہب تشبہہ"

"تلازم اختراعی"

"مجموعہ استوانی"

"اختلاف استلزامی"

"نفس اجتماعی"

"جذبات لاقوتی"

"حقیقتِ خارجیہ"

"ردِ عمل"

"شعور ذات" اور

"شعور اجتماعی"

کے قلعے بناتے جا رہے ہیں اور گراتے جا رہے ہیں۔ "لطافت و کثافت اولیٰ" کے گنبد میں طبیعات کے ماہرین "خارجی اور داخلی" عمل کی رسہ کشی کر رہے ہیں اور اپنے افکار عالیہ (!) کے نقوش بناتے ہیں اور بگاڑتے ہیں بناتے ہیں اور بگاڑتے ہیں ——— کہیں دماغوں کے "خلا" میں "رطوبت زجاجیہ" اور "تعادل غیر قائم" کے نظریئے کو واتے اور دوڑاتے جا رہے ہیں ——— نظریئے ہیں کہ آپس میں ٹکرا رہے ہیں اپنتے دیر نہیں ہوتی کہ بگڑ جاتے ہیں، علوم کی فہرست دیکھئے تو وہ ایک شیطان کی آنت ہے۔ علم سیاست علم نباتات۔ علم الافلاک۔ آثار قدیمہ اقتصادیات۔ معاشیات۔ علم النفس منطق۔ فلسفہ۔ ہندسہ۔ مخطوطات۔ مجسمات۔ علم مثلث۔ طبیعات ——— مابعد الطبیعات۔ ریاضی۔ طبقات الارض اور خدا جانے کیا کیا؟ کد و کاوش کی کوئی انتہا نہیں۔ اس تمام کد و کاوش کا آخری نقطہ۔ نتیجہ۔ ماحصل؟ یہ ہے کہ:-

وانکس کہ نہ داند و بداند کہ بداند!

در جہل مرکب ابد الدھر بماند!

اس جہل مرکب کا نام ہے۔ تہذیب۔ تمدن اور علم و فضل!!

اصطلاحیں ہیں اور الفاظ کی ترکیبیں اور دماغی الجھنے اسلجھاتے جاؤ!

اُلجھاتے جاؤ!!——

ایک دن کسی رسالہ میں ایک مزیدار لطیفہ پڑھا تھا۔ کسی پروفیسر صاحب نے اپنی ساری عمر حساب لگانے میں صرف کی۔ تب وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ دنیا کی عمر اب بیس لاکھ اور باقی ہے۔ انہوں نے زمین کے طبقات کا مطالعہ کیا۔ موسموں کے تغیرات پر غور کیا۔ زمین کی رفتار کا حساب لگایا۔ اجسام فلکی کے حالات پر نظر ڈالی سمندر اور خشکی کے گھٹتے بڑھتے رقبہ کو محسوب کیا۔ ساری عمر اس مصیبت میں مبتلا رہے۔ تب کہیں اس نتیجے پر پہنچے کہ دنیا ۲۰ لاکھ سال بعد ضرور ختم ہو جائے گی ایک دوسرے پروفیسر صاحب نے جب ان کا مضمون پڑھا تو وہ ایک صفر کم پڑھ گئے۔ اور سمجھے کہ اول الذکر پروفیسر صاحب کی رائے میں دنیا کی عمر صرف دو لاکھ برس باقی ہے۔ انہوں نے اسی بنیاد پر ایک جوابی مضمون لکھا اور ثابت کیا کہ دنیا کی عمر ۲ لاکھ سال سے بہت زیادہ باقی ہے! پھر تو دونوں طرف سے رسائل میں بحث مباحثہ کا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ گویا کہ ۲۰ لاکھ اور ۲ لاکھ کے فرق پر ان دونوں پروفیسر صاحبان کی زندگی کا انحصار تھا ان بے وقوفوں کی نظر اس پیش پا افتادہ حقیقت سے دور رہی کہ دنیا کا خاتمہ تو اسی دن ہے جس دن ان کی دنیوی زندگی کا خاتمہ ہوگا۔ سوال تو صرف دس پانچ سال کا تھا ——— ادھر یا اُدھر —— اور بحث ہونے لگی۔ بیس لاکھ اور دو لاکھ کے فرق پر!

اسی طرح ایک زمانہ سے اجرام فلکی اور دنیا کے درمیان طول مسافت ناپا جا رہا ہے۔ سفر کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مریخ سے پیام وسلام کے ذرائع پیدا کئے جا رہے ہیں۔ گویا کہ اس دنیا اور مریخ کے درمیان ڈاکخانہ اور تار گھر قائم

کر کے ہماری دنیا پر بڑا ہی احسان کیا جائے گا۔ گھر کے صحن سے دروازہ تک اور دروازے سے سڑک تک کے سفر پر تو اختیار حاصل نہیں اور انتظام ہو رہے ہیں ۵ کروڑ میل کا سفر ۵ دن میں طے کرنے کے!

تو کارِ زمیں را نکو ساختی

کہ با آسماں نیز پرداختی

—— کوئی پوچھے کہ احمقو! اگر تم نے یہ معلوم بھی کر لیا کہ اِس دنیا اور مریخ کے درمیان صحیح فاصلہ کیا ہے۔ تو ساری عمر اسی حساب میں کھپا دینے کے بعد تمہاری احمقانہ محنتوں کا نتیجہ کس کے کام آئے گا۔ اصل یہ ہے کہ ہماری ساری زندگی مصطلحات اور محاورات اور قیاسات اور تصورات کے اُلجھیڑے میں اُلجھی ہوئی ہے۔ انسان کا تمام تر مادی اور روحانی وجود اس اُلجھیڑے میں اسطرح پھنسا ہوا ہے۔ جس طرح جال میں ایک چڑیا۔ واہمہ کی عمارتیں بہت بلند اور بہت عالیشان بنائی جاتی ہیں۔ مگر اِن سب کی بنیاد اس حقیقت مسلمہ پر ہوتی ہے۔ جس کا نام "قانون فنا" ہے۔ ماہرین علوم بنیاد کو تو دیکھتے نہیں۔ سَر اُٹھائے اُونچی محرابوں اور بلند میناروں اور عالیشان گنبدوں کو دیکھنے میں محو ہیں —— آسمان کی طرف منہ اُٹھائے ہوئے ہیں۔ زمین کی طرف ان کی گردن جھکتی ہی نہیں ہر شخص اپنے واہمہ پر ایک لیبل لگا دیتا ہے جبّہ و عمامہ کے لیبل الگ ہیں۔ سائنس اور علوم کے لیبل الگ ہیں۔ ان کے خدا کو یہ نہیں مانتے اور ان کے خدا کو وہ نہیں مانتے۔ دُنیا اور عاقبت کے فیصلے دونوں کر رہے ہیں —— اپنے اپنے حلقۂ احمق میں! کچھ اصلاحی صفات مقرر کر لی

گئی ہیں۔ اچھے بُرے کا ایک معیار مقرر کر دیا گیا ہے ــــــ یہ اچھا، یہ بُرا!
یہ گناہ ۔ یہ ثواب ۔ یہ صحیح ۔ یہ غلط، یہ پاک، یہ ناپاک ــــــ کیوں ؟ وجہ ؟
ثبوت ؟ ــــــ جواب کا توڑ کرہی گیا، سوال کرنا بھی گناہ ہے! مولانا کا
عصا ۔ ماہر علوم کا قلم دونوں میں گتھم گتھا ہے ۔ بیچ میں پس رہا ہے ۔ وہ غریب
جو اس دنیا میں امن، آسودگی اور سکون قلب کے ساتھ اپنی مختصر زندگی گذارنا
چاہتا ہے اور نہیں گذار سکتا ۔ اس کو احکام دیئے جاتے ہیں ــــــ
دلائل سے بے نیاز، اس پر فیصلے عائد کئے جاتے ہیں ــــــ اس کے
فہم و ادراک سے بعید! ہدایات نافذ کی جاتی ہیں ۔ چون و چرا سے بالا ــــــ
ــــــ زندگی کے اس گہرے کہر میں مجبور و معذور انسان ٹٹولتے ۔ ٹھوکریں
کھاتے، گرتے، گھسٹتے چلے جا رہے ہیں کچھ نہیں جانتے ــــــ
سوائے اس کے کہ "اختیار" کچھ نہیں اور "جبر" بے پناہ ہے ــــــ
ــــــ اختر کہنے لگا ۔ تمہارا روزنامچہ چھاپا جائے تو کیا ہو؟ میں نے
کہا ہو گا کیا؟ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ مذہب اور عقل کے ٹھیکیدار
مجھ سے خفا ہو جائیں گے، ہو جائیں! اگر مذہب والے مجھے جنّت کی نعمتوں
سے محروم کر دیں اور عقل والے مجھے پاگل خانہ میں داخل کرادیں تو میرا
کیا نقصان ہے ۔ میں نہ مذہب کی دی ہوئی جنّت کی تمنا رکھتا ہوں ۔
نہ عقل کی محفلوں میں بار پانے کی خواہش ۔ پھر دنیا اور دین کے یہ ڈکٹیٹر
مجھ سے خفا ہو جائیں تو مجھے کیا پروا ــــــ ہو جائیں خفا!! ــــــ

۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء

روزنامچے کے گذشتہ اندراج کو اختر نے بہت ناک بھوں سکیڑ کر پڑھا۔ کہنے لگا۔ یہ سب پاگلوں کی سی بکواس ہے۔ زندگی کے سارے راستے بند کرتے ہو اور خود کوئی راستہ پیدا نہیں کرتے۔ چاہتے کیا ہو؟ میں نے کہا صاحبزادے زندگی کے راستے کہیں پیدا کرنے سے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ ہوا پچھوا یا ہو تو تم اس کو پروائی نہیں بنا سکتے۔ موسم برسات کا نہ ہو تو تم بادل کہاں سے لاؤ گے۔ یہ سب کارخانہ مقرّر ہے نہ کبھی ہو تو ہمارے تمہارے اختیار سے باہر ہے۔

ساری زندگی اختیار سے باہر ہے۔ تم جو ہوا کے لئے رفتار اور بادلوں کے لئے بارش کے قواعد وضوابط نافذ کرنا چاہو تو یہ کس کے بس کی بات ہے زندگی چلنی ہے جس طرح چلتی رہی ہے۔ قافلہ کا رُخ تم بدل نہیں سکتے منزلیں مقررہ ہیں راستہ کہیں ہموار کہیں ناہموار جیسا ہے ویسا ہے۔ تم جو کہو۔ لاؤ سیمنٹ کی ایک اعلیٰ سڑک تیار کر کے اس پر سفر کریں تو یہ گرہ بھر کی زبان ہل کر رہ جائے گی۔ ہونا کچھ بھی نہیں! اسی لئے کہتا ہوں ان جھگڑوں میں نہ پڑو۔ جس طرح گذر رہی ہے گذارے جاؤ۔ دھوپ ہو تم سایہ پیدا نہیں کر سکتے رات ہو جائے تو تم سورج کو نکال نہیں سکتے۔ نہ اندھیرے میں اُجالا کر سکتے ہو۔ نہ اُجالے میں اندھیرا دونوں حالتوں میں! ہر حالت میں گذرے چلے چلو۔ لڑکپن۔ جوانی

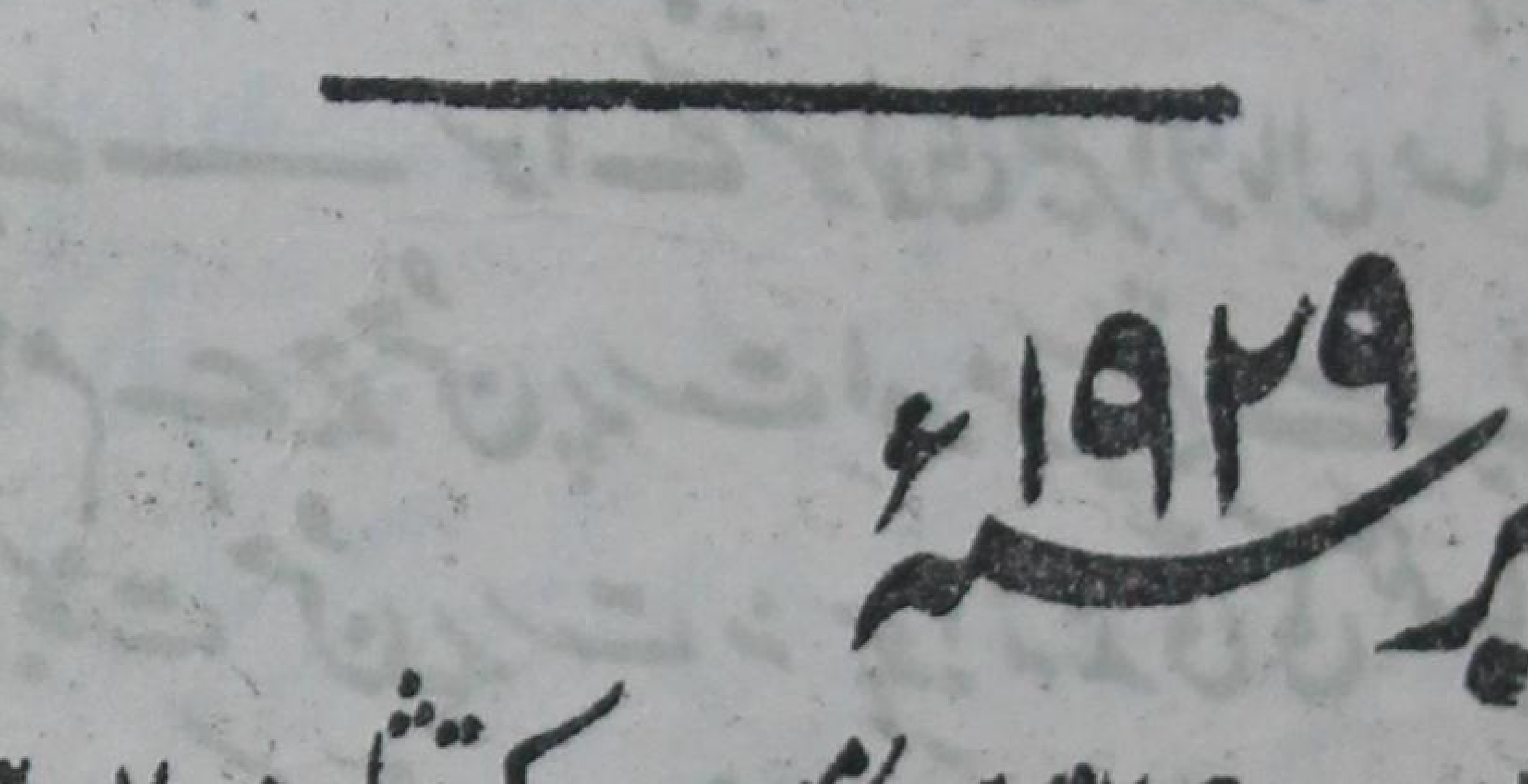
بڑھاپا جس منزل پر گزرو۔ اسی منزل کے دستور کی پابندی کرو — اور کچھ بھی کرنا نہیں ——— نہ سوچنا۔ نہ دیکھنا۔ نہ شکایت و شکوہ۔ نہ آرزو نہ کوشش —

اختر ہنس کر کہنے لگا۔ آج کل بازارِ حسن کچھ "مندا" ہے۔ تم عشق بازی میں مبتلا رہتے ہو تو کم از کم یہ تو ہوتا ہے کہ اس قسم کی بکواس نہیں کرتے۔ میں نے کہا بازارِ حسن میں بھی خرید و فروخت اختیاری نہیں۔ جبری ہے جب وقت آتا ہے۔ جب ہی عشق کا دورہ بھی شروع ہوتا ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کوئی مجھ سے فرمائش کرے کہ عاشق ہو جاؤ اور میں بہ تعمیل ارشاد یا "بپاسِ خاطرِ اس عزیز" فوراً عاشق ہو جاؤں!

---

۲۸ اکتوبر ۱۹۲۹ء

باپ بیٹا اور روح القدس مسیحیت کی تثلیث ان ہی تین پر مشتمل ہے اسی طرح دوسرے مذاہب کے بھی مقررہ ارکان ہیں۔ میرے مذہب کے ارکان بھی تین ہیں۔ جرمنی میں ہٹلر کا قومی نشان سواستیکا ہے۔ میرا نشان ایک ہے جس کی تثلیث اس طرح قائم ہے:—



اس مثلث کے تین اضلاع کے اندر میری تمام دنیا بند ہے میں ان ہی "اضلاع" پر گھومتا رہتا ہوں اور اسی چکر میں مست ہوں جس شخص کو اس تثلیث میں سے ایک ہی میسر آ جائے وہ کس قدر خوش نصیب ہے میری قسمت کی قسم کھاؤ کہ مجھے تینوں حاصل ہیں۔ کس قدر مشکل۔ اِن تینوں میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا۔ حُسن، موسیقی اور شراب اِن میں سے ایک بھی ہاتھ آ جائے تو باقی دو حاصل ہو جاتے ہیں۔ حُسن آتا ہے تو شراب کی مستی اور موسیقی کے کیف تمام کو بھی ساتھ لاتا ہے! شراب آتی ہے تو اکثر حُسن اور موسیقی کو بھی لاتی ہے۔ موسیقی آتی ہے تو حُسن اور شراب اس کے دامن سے لپٹے ہوتے آتے ہیں! کون بد نصیب ہے جو اس مثلث سے باہر جانا چاہے ـــــ سوائے مولوی خیر الزماں صاحب قبلہ کے، وہ شخص ایک جوہرِ خام ہے جو حُسن پرست اور موسیقی سے بے تعلق رہے یا جو مے نوش اور کم بخت حُسن پرست نہ ہو! زندگی کی تکمیل تو اسی وقت ہوتی ہے جب اس مثلث کے تینوں اضلاع مکمل اور زاویے مرتب ہوں۔

۱۰؍ اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء

خواب میں تصویریں۔ جیسے سینما کے پردے پر گذرے ہوئے افسانے تازہ ہو جاتے ہیں۔ مردے قبروں سے نکل نکل کر میری آنکھوں میں گھس جاتے ہیں۔ بھولی ہوئی باتیں یاد آتی ہیں۔ ایک ایک تصویر پردہ پر نمودار ہوتی ہے۔ میں اس کو پہچانتا ہوں ——— گم ہو جاتی ہے ——— یہ کون ہے؟ کملا دیوی! کیا قیامت تھی کمبخت ——— یہ کون؟ نور جہاں! کس قدر شوخ تھی اس کی جوانی ——— یہ موہنی! وہ خاص باغ کی راتیں! مرمریں حوض کے کنارے، چاندنی کا عکس پانی کی ہلکی ہلکی لہروں پر، فوارے کی بندیاں ہیں اور میرے آغوش میں موہنی ——— خدا جانے کہاں ہے۔ ——— یہ انجمن آرا، میرے محفل شباب کی نورانی شمع ——— کس قدر جلد خاموش ہو گئی ——— تیتری کی طرح رنگین مگر جان ہار، صبح کے ستارے کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے غروب ہو گئی! یہ کون ہیں؟ نام یاد نہیں آتا، صورت یاد ہے، مجھ سے روٹھ کر چلی گئی تھی، پھر کبھی لوٹ کر نہ آئی ——— یہ وہ ہیں جنہوں نے دو برس مجھے دنیا سے بے خبر رکھا ——— نظر میں نشہ باتوں میں مستی، اداؤں میں کیف، دو برس اس طرح آغوش میں رہی کہ وہ مزا اب تک یاد ہے ——— ایسی کتنی تصویریں میرے وجود معنوی کے پردے پر نمایاں ہوتی ہیں۔ مگر ان سب میں ماضی کے تمام منظر عام میں، اس تمام انتشار میں، ایک دھندلی سی تصویر اور بھی ظاہر ہوتی ہے۔

ظاہر ہوتی ہے پھر غائب ہو جاتی ہے۔ پھر ظاہر ہوتی ہے، ابھی اچھی طرح دیکھا نہیں کہ پھر غائب ہو جاتی ہے۔ آنکھوں کا پردہ اُٹھتا ہے اور گرتا ہے بار بار، جلدی جلدی، آنکھوں کو دیکھنے کی مہلت نہیں ملتی۔ مگر دل بے چین ہو ہو کر کہتا ہے۔ ہو نہ ہو یہ تو اُس کی تصویر ہے! —— میں بھولا کیوں نہیں اب تک؟ میں بھول کیوں نہیں سکتا؟ وہی ہے اگر یہ تو پھر؟ کیا وہ کانٹا ابھی تک میرے دل میں اٹکا ہوا ہے؟ یاد آتی ہے۔ گذری ہوئی محبتوں کے مجمع میں سب سے الگ نظر آتی ہے، وہ سب بھلائے جا چکے ہیں جن کی تصویریں کبھی کبھی نظروں کے سامنے آتی ہیں مگر —— یہی ایک ہے جس کو بھولا نہیں۔ بھلا نہیں سکا! ——————————

لیلیٰ! لیلیٰ! لیلیٰ!!!

---

۱۲ اکتوبر ۱۹۲۹ء

کوئی کہتا ہے مجھے دستاویز پر دستخط کرنے ہوں گے۔ اقرار نامہ لکھنا ہوگا —— تو بھاگ نہیں سکتا، تو بچ نہیں سکتا، تو سستے سودے کرنے کا عادی تھا مگر یہ سستا سودا نہیں، یہ معاملہ ہی کچھ اور ہے —— میں گھبرا گھبرا کر کہتا ہوں مجھے گرفتار نہ کرو۔ میں دستاویز پر دستخط نہیں کر سکتا، میں نے کبھی ایسا نہیں کیا، میں کبھی ایسا نہ کروں گا۔ میں "بازاری" آدمی ہوں۔ وہ "بازاری" عورت ہے۔ ہم دونوں ہم جنس ہیں۔ یکساں ہیں کوئی کسی کا پابند نہیں۔ کوئی

کسی کا احسان مند نہیں، کوئی کسی کا مقروض نہیں، بازار کا سودا ہے۔ پھر کیوں کہتے ہو کہ "دل دویں نقد لا"۔ "دل دویں" سے کیا بحث؟ ــــ کوئی نہیں سُنتا اور ایک بھاری چادر ہے ــــ بے خبری مجبوری اور بے اختیاری کی جس میں مَیں لپٹا جا رہا ہوں!!! ــــ کہاں ہے؟ ہنوز بازار میں ہے، یا کسی گوشۂ عزلت میں یا قبر کی تاریکی میں؟ کہاں ہے؟ معلوم کرنا چاہتا نہیں مگر خبر کا منتظر ہوں کچھ سُننا نہیں چاہتا مگر گوش بر آواز ہوں۔ کیا ہونا ہے؟ اگر وہ ہونا ہے جو نہ ہونا چاہیئے تو پھر ہو کر رہے گا۔ جو کچھ ہونا ہے، یوں ہی سہی، اگر نہ بچ سکنا ہی مقدر ہے تو یوں ہی سہی!! "جبر" ہے "اختیار" نہیں ــــ

---

۱۸ اکتوبر ۱۹۲۹ء

لیلیٰ ــــ لیلیٰ ــــ لیلیٰ!!

لیلیٰ!! ــــ

---

۱۹ اکتوبر ۱۹۲۹ء

لیلیٰ! ــــ لیلیٰ!! ــــ

لیلیٰ!!! ــــ

۲۰ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء

صبح ———— لیلیٰ!

شام ———— لیلیٰ!

شب ———— لیلیٰ!

۲۱ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء

روزنامچہ کے بہت سے اوراق خالی ہیں۔ میری زندگی میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے ———— میر صاحب خبر لائے ہیں کہ وہ بنارس میں ہے حسن کی دولت دونوں ہاتھوں سے لٹا رہی ہے ———— بنارس! میرے شانوں پر پر پیدا ہو رہے ہیں! ———— خط لکھوں ———— بلاؤں ———— کسی کو بھیجوں؟ ———— خود ہی جاؤں ———— کرنا کیا ہے؟

۱۱ر دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء

تقریباً ۱½ ماہ کے بعد آج یہ روزنامچہ کھولا گیا۔ یہ ۱½ مہینہ بنارس میں گذرا۔ اس طرح کی خبر نہیں۔ کب آیا، کیونکر آیا، یہ زمانہ کیسے گذرا؟ اختر

لو میر صاحب میرے پاس موجود ہیں اور کہتے ہیں کہ میں سخت بیمار تھا۔ لب گور تھا۔ اطباء جواب دے چکے تھے۔ احباب مایوس ہو چکے تھے ——
میں کہتا ہوں یہ سب غلط ہے —— جب میرے سرہانے بیٹھے نے ۵۴ دن اور ۵۴ راتیں گذاری ہوں۔ اس کے ہاتھوں نے میرے خشک لبوں کو پانی سے تر کیا ہو۔ اس کی انگلیاں میری نبض پہ کھیلی ہوں۔ اسکی آواز کی موسیقی نے میرے دل و دماغ کو سکون بخشا ہو! —— تو کس کی مجال ہے کہ وہ کہے کہ میں بیمار تھا!! حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی عمر میں کبھی اتنا تندرست نہ تھا۔ جس قدر کہ گذشتہ ڈیڑھ ماہ میں رہا۔ جب میرے جسم کی حرارت ۱۰۵ اور ۱۰۶ درجہ پر تھی!! زندگی کا شعلہ میرے جسم میں کبھی پہلے اس قدر روشن نہ تھا میری روح کبھی اس قدر قوی نہ تھی —— یہ آنکھوں کے اندھے مجھے بیمار گنتے ہیں! بیماری تو اب شروع ہوتی ہے۔ جب کہ میرا سرہانہ خالی ہے۔ اور تیمار دار چلا گیا —— وہ کہتی ہے۔ تم اس شہر میں اجنبی تھے مجھ سے ملنے آئے تھے۔ میرے مہمان تھے۔ میں نے حق مہمانداری ادا کیا! ——
اب تم اپنے وطن جاؤ۔ میں اپنے کاروبار میں مشغول ہوتی ہوں! میں نے کہا۔ شہد کے بعد اب یہ زہر کیوں؟ کہتی ہے تم معذور تھے۔ اس لئے میری توجہ کے مستحق تھے۔ اب تم معذور نہیں ہو —— اپنے گھر جاؤ اور اگر میری دکان پر آنا چاہتے ہو تو ایسے آؤ جیسے سب گاہک آتے ہیں ——!
میر صاحب اور اختر کے طعنوں نے کلیجہ پکا دیا ہے۔ زہر میں بجھے ہوئے تیر مجھ پر دن رات چلائے جا رہے ہیں! "بس! تم کی تمام شد!"

مردمیدان نے ہتھیار ڈال دیئے! کمر کھول دی! سرفرازوں کے سر اس طرح بھی خاک پر رکھے جاتے ہیں، شہسواریوں بھی گھوڑوں کے قدموں میں روندے جاتے ہیں! یہ بھی ہوتا ہے؟ یوں بھی ہوتا ہے؟ آسمان کا ٹھوکا حلق ہیں —— فتح مندی کے دعوے فنا ہوئے۔ اس عبرتناک شکست ہیں بس! —— میں کچھ نہیں کہتا۔ بستر پر پڑا ہوا چھت کی کڑیاں گنا کرتا ہوں!

۱۲ر دسمبر ۱۹۲۹ء

جب حسن و عشق کی اُلجھنوں سے گھبراتا ہوں اور زندگی کی کشمکش سے دل اُکتا جاتا ہے۔ مذہب کے نام سے چڑ پاتا ہوں اور اخلاق و قانون کی پابندیوں سے دل میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے تو کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ دُنیا میں انسان کا سب سے زیادہ فطری مذہب "مذہب تشکیک" ہے۔ اس مذہب کی تعلیمات کو دُنیا میں کیوں نہ پھیلایا جائے —— مختلف ناموں سے پہلے بھی اس قسم کے عقائد کی تبلیغ کی جا چکی ہے۔ لیکن "مذہب تشکیک" کی کامل کامیابی کے لئے گذرے ہوئے زمانے کچھ زیادہ موزوں نہ تھے۔ لیکن اب —— عقل و مذہب کی آویزش نے اس مذہب کے لئے نہایت موزوں فضا پیدا کر دی ہے! کوئی وجہ نہیں کہ میں خود اس مذہب کا داعی اور پیغمبر بن کر میدان میں آجاؤں

اور اپنی تمام موجودہ اور آئندہ نسلوں کو اس مذہب کی طرف دعوت دوں اب
تک جتنے مذاہب دنیا میں آئے ۔ ان سب میں شیطان کی قوت رحمانی
قوتوں پر غالب رہی ۔ کوئی مذہب یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے "شیطانیت"
کو نابود یا مضمحل کر دیا ہو ۔ بلکہ تاریخ ہم کو بتاتی ہے ۔ کہ مذہبی اقوام کی زندگی
میں "اہرمن" کی رعایا تعداد میں "یزدان" کے غلاموں سے زیادہ رہی ہے
—— اصل یہ ہے کہ خود مذاہب نے "اہرمن" اور "شیطان" کو بہت
قوی پیدا کیا ہے اور قیامت تک کے لئے ان کی قوت کو انسان پر حاوی
و مسلط کر دیا ہے ۔ اس کے بعد اپنے بندوں کو ہدایت کی کہ اس قوت سے
لڑو —— مقابلہ کرو ۔ مارو ۔ گراؤ ۔ کہ یہی راہ نیکیوں کی ہے !! ——
"مذہب تشکیک" مذہب کی اس قدیم فرقہ بندی سے بالکل آزاد رہیگا وہ
"اہرمن" اور "یزدان" کی تفریق ہی کو سرے سے مٹا دے گا اور انسان کی دنیوی
زندگی کے پیش پا افتادہ حقائق پر اپنی تعلیمات کی بنیاد رکھے گا ۔ نظم اور
ضبط سے اس کے پیرو آزاد ہیں گے ۔ اس لئے کہ نظم و ضبط ہی سب سے
زیادہ بد نظمی اور افراط و تفریط کا باعث ہے ——

"مذہب تشکیک" میں زندگی کی تعریف یہ ہوگی :-

"زندگی یکسر انتشار ہے ناقابل علاج ، کسی چیز کو جزو عقائد نہ
بناؤ ۔ کسی چیز کا یقین نہ کرو ۔ اشیاء اور اشخاص کی بری اور
اچھی صفات محض اصطلاحی الفاظ ہیں ۔ ناقابل اعتبار ۔ جو
کچھ تمہارے سامنے آئے ۔ اس کو شک کی نظر سے دیکھو اور

زندگی کا نہ کوئی اصول بناؤ نہ کوئی کلیہ قائم کرو کسی اصول اور کلیہ کو تسلیم نہ کرو۔ "مذہب تشکیک" میں تسلیم و اقرار ارتداد سے بدتر اور عین کفر ہے۔ آزاد اور لا علم اور بے خبر رہو۔ جیسے تم پیدا ہوئے تھے! جستجو اور تلاش ایک جرم ہے۔ بصیرت گناہ ہے۔ تمہارے اندر سے فطرت جو اشارہ کرے اس کی تعمیل کرو۔ عقل اور فہم کی بیہودگیوں سے اپنا دامن پاک رکھو"

لوگ پیغمبری کے دعوے کر گئے ہیں مگر مذہب کے قدیم تخیل سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ ایک ہی ہیولہ کو مختلف صورتوں میں دنیا کے سامنے لاتے ہیں اور کسی نہ کسی ورثے میں "اہرمن" اور "یزدان" کا ایک تخیل لوگوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں! یہ سب غلط ہے۔ میں پیغمبری کا دعوے کرنے میں جلدی نہیں کرنا چاہتا۔ عدم تکمیل اور انتشار کی ایک انتہائی صورت دنیا کے سامنے لانے والا ہوں۔ تیاریاں کر رہا ہوں کہ میرے پیغمبرانہ پیغام میں ضبط و نظم کی کوئی خامی باقی نہ جائے۔ صرف چند زندہ اصول دنیا کے سامنے پیش کر دینا چاہتا ہوں جو میری "امت" کی زندگی کے فرضی تو ازن کو مبدل بہ انتشار کامل کر دیں گے۔ وہ انتشار کامل جو زندگی کے تمام حقائق میں سب سے زیادہ ناقابل انکار حقیقت ہے۔

رات میر صاحب سے میں نے کہا کہ میں چند روز بعد اپنی پیغمبری کا اعلان کرنے والا ہوں۔ ان بے چارے کا چہرہ شرقاً غرباً لمبا ہو گیا۔ کچھ داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگے۔ میاں! توبہ کرو! آج پیغمبری کا ارادہ ہے

تو کل خدائی کا دعویٰ کرو گے ؟ میں نے کہا، میر صاحب "مذہب لٹکیک" کا پہلا مبلغ تم ہی کو بناؤں گا !

جو لوگ زیادہ اللہ والے بنتے ہیں۔ ان ہی میں ارتداد اور کفر کی اہلیت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ان کا کفر خفی، مرتد کے کفر جلی سے زیادہ شدید ہوتا ہے ——— میر صاحب بے چارے تمہید کے دو چار ہی کلمے سُن کر عشاء کی نماز کے لئے اُٹھ گئے !!

---

۱۳ دسمبر ۱۹۲۹ء

کل پھر نکاح کا پیغام بھیج دیا۔ جواب بھی پا لیا۔ اس نے کہا ——— تقدیر میں یہی ہے تو مجھے "ہاں" کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہی ہونا ہے جو ہو گا۔ لیکن میرے معاملہ میں تدبیر اور رضا و رغبت کو بھی کچھ دخل ہے تو مر جاؤں گی۔ لیکن "ہاں" نہ کہوں گی ——— نہیں ! نہیں !! نہیں !!!

پھر اس نے میر صاحب سے کہا۔ تم کہہ دینا کہ ان تعلقات کی شعریت میں نکاح کی خشک اور بے نمک سنجیدگی کو شامل کر کے کیوں مجھے بے مزہ کرتے ہو ——— تیتریوں کی رنگینی اور بلبلوں کے نغموں کو قفس میں بند کرو گے تو رنگ اُڑ جائے گا۔ نغمے فنا ہو جائیں گے ! تم جو اپنی حسن پرستی پر مذہب کی جانب سے جواز کی مہر لگانا چاہتے ہو۔ تو مجھے اپنی طرح بلے وقوف کیوں سمجھتے ہو کہ میں بھی اپنی شعریت کو مذہب کے تخیل پر قربان کر

ڈالوں؟ محبت مجھ سے ہے تو کرو۔ مگر قبضۂ مالکانہ کی فکریں کیوں؟ جب مجھے خطرہ تھا کہ کہیں تمہاری "طلب" مجھے اسیر نہ کر لے میں بھاگ گئی تھی مگر اب جو تم وہی پیام پارینہ لے کر یہاں آئے ہو تو میں تمہاری "طلب" سے ذرا بھی نہیں ڈرتی! جواب مانگتے ہو؟ جواب یہ ہے کہ اپنے گھر جاؤ۔ کسی شریف خاندان کی ایک معصوم بچی کا ہاتھ پکڑ کر قاضی صاحب سے دو بول پڑھوا لو وہ تمہاری قانونی داشتہ اور مملوکہ ہو جائیگی اور تم اس کے مالک اور آقا بلا شرکت غیرے! وہ غریب جو پندرہ بیس برس تک گھر کی چار دیواری کے اندر ماں باپ کی غلامی کر چکی ہے تمہاری قید میں بھی قدرے آسودہ ہوگی۔ اس لئے کہ اس نے آزادی کا مزہ کبھی چکھا ہی نہیں! وہ زندگی کے صرف ایک ہی رُخ سے واقف ہے اور اسی میں خوش رہتی ہے اس کو کیا معلوم —— معصوم بچّی —— کہ غلامی کی اس دُنیا کے پرے ایک اور دنیا بھی بستی ہے۔ جہاں عورت، مرد موذی کے دھوکہ میں نہیں آتی۔ جہاں عورت اس طرح نہیں پہچانی جاتی —— کہ یہ فلاں کی بیوی یا بیٹی یا بہن یا ماں ہے۔ بلکہ وہ اپنی شخصیت علیحدہ رکھتی ہے —— مرد کے پھندوں سے آزاد اور سربلند! پھر اس نے میر صاحب سے کہا۔ میری طرف سے کہہ دینا مجھ سے محبت کرو! جس قدر کرنا چاہو۔ مگر میرے حال پر مہربانی کر کے اپنی جیب سے ہتھکڑیاں اور زنجیریں نکال کر مجھ سے یہ فرمائش نہ کیا کرو۔ کہ میں یہ زیور پہن لوں! جب تم ان زنجیروں کو لگاتے ہو۔ تو تمہارے آغوش میں مجھے جہنم کی

آگ بھڑکتی نظر آتی ہے —— میں بھاگتی ہوں ——
اور تم وہ زنجیریں ہاتھ میں لئے ہوئے میرے پیچھے پیچھے بھاگتے ہو!
—— یوں میرا ہاتھ آنا مشکل ہے۔ دنیا بہت وسیع ہے۔ میرے پنکھ بہت طاقت ور ہیں، آج تک کسی مرد کی مجال نہیں۔ کہ ان پر ہاتھ ڈال سکے! جب تک مجھے چاہتے ہو، میں تمہاری چاہت کے مزے لوٹ رہی ہوں۔ مگر جب تم نکاح کا حربہ لے کر میری طرف بڑھتے ہو تو زمین پر حقارت کے ساتھ تھوک کر آگے بڑھ جاتی ہوں ——
تم اور تمہارا نکاح کا پیغام! محبّت کا دعویٰ کرتے ہو۔ اور نکاح کا پیغام دیتے ہو! محبّت کو نکاح سے کیا واسطہ؟ کہہ دینا —— اس نے ہنس کر میر صاحب سے کہا —— کہ یا تو تم بالکل گدھے ہو یا نہایت چالاک بدمعاش!!

۱۵ر دسمبر ۱۹۲۹ء

گدھے اور بدمعاش کے القابوں سے میری تواضع ہو رہی ہے۔ وہ کہتی ہے تم تو مذہب کے قائل ہی نہیں۔ پھر میرے اپنے درمیان مذہب کا نام کیوں لیتے؟ یہ کیا تماشہ ہے۔ ایک ہی چیز تمہاری رائے میں تمہارے لئے زہر قاتل مگر میرے لئے

شہد خالص ہے ——— میں بھی سوچتا ہوں تو بات بے تکی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بات کیا ہے کہ جب لیلیٰ کا قدم درمیان میں آتا ہے۔ میری زندگی کا فلسفہ پھر درہم برہم ہو جاتا ہے۔ یا تو یہ ہے۔ کہ میں ایک مکار مرد کی طرح عورت کے لئے ایک ایسا قانون نافذ کرنا چاہتا ہوں جو مجھ پر کسی طرح عائد نہ ہو سکے۔ جو آزادیاں اور حقوق اپنے کو دیتا ہوں۔ وہی عورت کو دینا گوارا نہیں کرتا۔ چاہتا ہوں کہ اس کی زندگی کا ضابطہ میرا بنایا ہوا ہو یا تو یہ بات ہے اور یا یہ بات ہے کہ میری خواہش نے مجھے اتنا حواس باختہ اور مجبور کر دیا ہے کہ میں ہر صورت سے خواہ وہ میرے عقائد کے موافق ہو یا منافی اس عورت کو اپنا بنا لینا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ تو میری دلیلوں اور میری منطق کی کمزوریوں کو دیکھ رہی ہے۔ مرد چاہتا ہے۔ کہ عورت کو اس کی بھی اجازت نہ دی جائے۔!! جب "عیش" کی حالت میں ہوتا ہوں تو کہتا ہوں کہ زندگی یہی ہے۔ لیکن جب عشق کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو کہتا ہوں۔ میرا کوئی اصول نہیں۔ میرا کوئی عقیدہ نہیں۔ اس لئے کہ میں عاشق ہوں، وہ ہنستی ہے اور میرا منہ چڑا دیتی ہے۔ میں "عشق" سے خفا ہو کر پھر "عیاشی" کرنے لگتا ہوں اور "عیش" کو خوش کرنے کے لئے دنیوی زندگی کے تمام سنجیدہ اصولوں پر لات مارتا ہوں مگر "عیش" جب تھکا دیتا ہے تو پھر "عشق" مسلط ہو جاتا ہے۔ پھر میں نئی نئی الجھنیں اور نئے نئے مسئلے پیدا کرتا ہوں۔ ان گھوڑوں کو "عشق" کے میدان میں دوڑاتا ہوں۔ وہ ہنس ہنس کر تالیاں بجاتی ہے۔

میں رو رو کر سینہ پیٹتا ہوں ۔ کبھی کوئی دوست کہتا ہے ۔ ایک ارادہ کر لو، میں بھی کہتا ہوں کہ ایک ارادہ کیوں نہ کر لوں —— یا ادھر یا ادھر —— لیکن "ارادہ" کے نام سے "عیش" بھی ناخوش ہوتا ہے اور "عشق" بھی ۔ وہ دونوں کہتے ہیں ۔ کہ ہمارے مُلک میں اس جنس کا گذر نہیں! "ارادہ" جب تک ساتھ ہوگا ۔ ہماری بارگاہ میں گھسنے نہ پاؤ گے ۔ ان دو دیوتاؤں کے درمیان میں بہا چلا جا رہا ہوں!! —— ایک دریا کا دھارا کہ مجھے بہائے لئے جا رہا ہے ۔ پہاڑیوں کی وادیوں میں میدانوں اور صحراؤں کے سینہ پر جنگلوں اور نخلستانوں کے سایہ میں اور تپتے ہوئے بیابانوں میں! کب تک یہ حال رہے گا ۔ کہاں لے جا کر یہ دھارا مجھے سمندر کی سطح پر ٹپکے گا؟

—— سوچتا ہوں، پھر اپنے سے بگڑتا ہوں ۔ کہ سوچا کیوں، پھر سوچتا ہوں ۔ عیش، عیش، عشق، عشق، —— ان دونوں کے درمیان کوئی راستہ پیدا ہوتا ۔ ان دونوں سے الگ کوئی دروازہ کھلتا! کبھی کبھی مجھے فرنگی شاعر کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں:

اندھیری رات میں بچہ روتا ہے —— روشنی کے لئے!

۹ار دسمبر ۱۹۲۹ء

اختر کہتا ہے گھر چلو۔ اپنی عقل درست کرو، دماغ کے جو پیچ "ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ اُن کو پھر تھوڑا کس دو، عورت کے لئے بے قرار ہونا مرد کی مردانگی سے بعید ہے۔ شیر اگر بکری کے عشق میں رو دیا کرے۔ تو فاقے کرتے کرتے مر جائے ـــــ شیر اور بکری کی مثال دل پر چپکتی ہے کہتا ہوں کہ لاؤ "لیلےٰ" کے دروازے کے سامنے ہی عورت کی ساری نسل کو ذلیل کروں اور کہوں کہ دیکھو او سنگدل اور بے مروت مرد ایسے ہوتے ہیں! ـــــ دوسرے ہی لمحہ میں یہ سب ارادے ہوا ہو جاتے ہیں۔ لمبا لمبا لیٹ جاتا ہوں، اختر پھر دن بھر کچھ کہے دیتا ہے! ـــــ رات اختر ایک بناری مسمات کو کہیں سے پکڑ لایا۔ بہت شوخ وطرار۔ زبان قینچی، آنکھیں بجلی، ہاتھ پاؤں چنچل، بھویں تنی ہوئی ـــــ وہ تو آگر پھیل پڑیں۔ کبھی وہ میری گود میں۔ کبھی میں اُن کی گود میں۔ ظالم نے اس قدر پلائی کہ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ آدھی رات گذر گئی۔ مجھے ہوش نہ تھا کہ کہاں ہوں؟ ہزاروں قصے، ہزاروں داستانیں، حسن کی کارفرمائیاں۔ عشق کی فتح مندیاں سب ہی کچھ کہا گیا اور سنا گیا۔ اُس نے اپنے عاشقوں کے قصے سُنائے، میں نے اپنے معشوقوں کے افسانے۔ کہنے لگی۔ بتاؤ تم نے سب سے زیادہ کس کو چاہا؟ میں نے کہا "لیلےٰ کو ـــــ مگر اب اُس سے نفرت ہے۔ کہنے لگی اگر نفرت ہے تو تم جھوٹے ہو۔ تم نے چاہا ہی نہیں! میں نے کہا

چاہا تو ایسا ہے کہ کوئی کیا چاہے گا، مگر اس نے قدر نہ کی۔ کہنے لگی وہ تمہیں پہچان گئی ——— خالی ڈھول کو ہر عورت پہچان لیتی ہے — میں نے کہا ——— کم ظرف ہے۔ وہ کہنے لگی کم ظرف وہ نہیں تم ہو ——— اس کے آئینہ میں تم نے اپنی صورت دیکھ لی ——— غرض بات بڑھتی گئی ——— شراب کا دَور چلتا گیا، بات بڑھتی گئی ——— میں نے کہا، میں اُسے جلانا چاہتا ہوں، ذلیل کرنا چاہتا ہوں، دکھا دینا چاہتا ہوں کہ اس سے زیادہ حسین عورتیں مجھے نصیب ہیں ——— چل! میں نے کہا۔ چل ذرا "لیلےٰ" کے گھر چلیں تو ذرا، اس سے دو باتیں کر۔ اور میں ذرا اپنے کلیجہ کے پھپھولے پھوڑ لوں ——— میں سمجھتا تھا، وہ راضی نہ ہوگی، وہ فوراً راضی ہو گئی! ہم دونوں اسی وقت "لیلےٰ" کے گھر پہنچے، مشکل سے دروازہ کھلوایا۔ بستر پر لیٹ چکی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُٹھ بیٹھی۔ — میں نے ہاتھ پکڑ کر بنارسی مسمات کو آگے بڑھایا ——— "معاف کرنا لیلیٰ ہم اور یہ ہوا خوری کے لئے نکلے تھے۔ جی چاہا کہ تم سے بھی ملتے چلیں ——— وہ مُسکرائی۔ تشریف رکھئے، چشم ما روشن ——— آدھی رات کی ٹھنڈی ہوا کچھ میرے لئے بھی لائے ہوتے ——— بہت حبس ہے"۔ دونوں کا تعارف کرا کے میں فرش پر لیٹ گیا ——— دیکھوں یہ دونوں تیتریاں کس طرح ایک دوسرے پر حملے کرتی ہیں ——— "لیلےٰ" اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ اُس کے چہرے پر میری اِس عجیب حرکت کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ اُس کے لبوں پر

وہ لازوال تبسم جو میں نے کسی دُوسرے کے لبوں پر آج تک نہیں دیکھا بدستور موجود تھا۔ آنکھوں میں ایک قہقہہ جھوم رہا تھا۔ لہجہ میں شرارت تھی جو اثر میں پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اِس کا ہلکا سا عکس بھی نمایاں نہ ہُوا۔ میں نے مایوس ہو کر آنکھیں بند کر لیں ——— تمہیں نیند آ رہی ہے سو جاؤ، میں دوسرے کمرے میں آرام کر لوں گی۔ یہ کہہ کر اُس نے میرے شانہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ نشہ میرا تیز تھا۔ اِس ہاتھ سے نکل کر بجلی کی ایک رَو جسم میں دوڑی ——— میں نے کہا۔ نہیں میں جاؤں گا۔ کھڑا ہو گیا۔ ٹانگوں نے سہارا نہ دیا۔ پھر میں بیٹھ گیا ——— لیلیٰ نے کہا۔ "اب تم وہ تو میں کو نہ جانے دوں گی۔ میرا بستر خوش قسمتی سے آج خالی ہے ——— وہ مُسکرائی ——— تم دونوں آرام کرو ——— اِس کے بعد کچھ میں نے کہا ——— یاد نہیں کیا کہا ——— کچھ اِس نے کہا، یاد نہیں کیا کہا ——— صُبح آنکھ کھُلی تو میں نے اپنے کو اُس کے بستر پہ پایا۔ میرے پہلو میں وہ بنا بی مستمات سو رہی تھیں۔ اُن کے منہ کی بھاپ میرے رُخساروں سے ٹکرا ٹکرا کر سارے کمرے کو گرم کر رہی تھی ——— گھبرا کر اُٹھ بیٹھا ——— "لیلیٰ" ——— "لیلیٰ"۔ اختر نے کمرے کا دروازہ کھولا ——— کہاں ہے؟" میں نے سوال کیا۔ اختر نے کہا۔ وہ تو چلی گئیں۔ صبح تمہارے جاگنے سے پہلے ہی روانہ ہو چکی تھیں۔ ایک ملازم اور کچھ سامان باقی ہے۔ ملازم کہتا ہے کہ بمبئی گئیں ——— خدا ہی جانے! ——— تمہارے نام یہ ایک پرچہ لکھ کر دے گئی ہیں ——— لکھا تھا "رات کا کھیل ختم"

تھا۔ مگر میں خوش ہوں۔ اپنی زندگی کی شعریت کو فنا نہ ہونے دو۔ کھیلے جاؤ۔ زندگی کے اس چٹان پر زمانے کے طوفانوں کی کچھ پروا نہ کرو۔ جھولو میں جھولو۔ باغوں میں کھیلو، اور کبھی سوچو مت! جب تک غور و فکر سے آزاد رہوگے، سوچنا موت کا پیام ہے، کچھ مت سوچو! یہ وہ نسخہ ہے جو میں بھی استعمال کرتی ہوں ـــــ میں تو کل سے پہلے ارادہ کر چکی تھی۔ بنارس جانا ضرور تھا، تمہاری نیند کو خراب کرنا مناسب نہ سمجھا ـــــ یہ دنیا بہت تنگ ہے۔ اس لئے یقیناً کسی دن پھر ہم تم ملیں گے ـــــ گم تھوڑی ہو سکتے ـــــ خدا حافظ!

خاتمۂ کلام

رات میں نے اس کو قتل کر ڈالا تھا۔ وہی جو میرے اندر بیٹھا رہا کرتا تھا۔ جو مجھے ڈراتا تھا، دھمکاتا تھا ـــــ وہ جو ہر وقت میرے دل کو کریدتا رہتا تھا۔ یہ نہ کیجیو۔ یہ گناہ ہے۔ کبھی کہتا تھا یہ کرو۔ یہ ثواب ہے۔ کبھی کہتا تھا تو دوزخ میں جائے گا۔ کبھی کہتا تھا تو جنت کے قابل بن جا ـــــ وہ جو میرے عیش کو چٹکیاں لے کر پراگندہ کرتا تھا۔ وہ جو سوئیاں چبھو کر مجھے بے چین کرتا رہتا تھا۔ کبھی جنت یاد دلاتا تھا۔ کبھی دوزخ! کبھی روح اور خدا اور موت کے افسانے سناتا تھا۔

کہانیاں — جھوٹی داستانیں — لغو حکایتیں — بے معنی!!
رات میں نے اس بے تمیز کو قتل کر ڈالا! اور میں مطمئن ہو کر سو گیا! —

صبح میں نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھا۔ یہ سمجھ کر مقتول کی جگہ خالی ہو گی لو! وہ تو پھر وہاں موجود تھا — وہی کم بخت! — اس نے کہا گدھے! تو ہر رات مجھے قتل کرے گا اور میں ہر صبح زندہ ہو کر اپنے مسکن میں آ بیٹھوں گا! — ہر روز، ہر صبح تو مجھے یہیں پائے گا۔ جہاں ہوں — مہذب، متمدن — جانور —

اب کوئی مجھے بتائے میں کیا کروں؟؟